شرک کا دوسرا سرچشمہ، حسی میلان ورغبت

اشارہ:

جب انسان اس دنیا جہان میں آنکھ کھولتا ہے تو وہ اپنے حواس خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، چکھنے، ٹٹولنے اور سونگھنے کے ذریعے اپنے گردوپیش کی اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے اور انہیں کو اپنے علم وخبر کی اساس قرار دیتا ہے۔ پھر جوں جوں اس کے علم ودانش میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ تدریجا مسائل عقلی وفکری سے واقف ہوتا ہے۔

لیکن کچھ لوگ اپنی علمی پسماندگی کے باعث محسوسات ہی پر رُک جاتے ہیں۔ اس کے بعد نہ انہیں کسی چیز کا علم ہوتا ہے اور نہ وہ اس پر ایمان لا سکتے ہیں۔ اس بناء پر وہ چاہتے ہیں کہ خدا کا وجود حسی ہو کہ وہ اسے دیکھیں اور اپنے ہاتھوں سے مس کریں۔

طول تاریخ میں خدایان محسوس اور بت پرستی کا سب سے اہم سرچشمہ یہ حسی میلان ورغبت ہی رہا ہے، اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن عظیم کی طرف متوجہ ہوتے اور درج ذیل آیات پر غور کرتے ہیں۔

(۱) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا ﴿۲۱﴾ [۲۵:۲۱] (فرقان)

(۲) يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾ [۴:۱۵۳] (نساء)

(۳) وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳۸﴾ [۲۸:۳۸] (قصص)

(۴) وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ [۱۷:۹۰] اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ [۱۷:۹۱] اَوْ

تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾

(اسراء)

(۵) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ [۲:۲۱۰] (بقرۃ)

ترجمہ:

(۱) جولوگ ہمارے حضور پیش ہونے کی فکرنہیں رکھتے (روز قیامت کے منکر ہیں) وہ کہتے ہیں کیونکہ فرشتے ہم پر نازل ہوتے ہیں یا ہم اپنے پروردگار کو ان آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے؟ انہوں نے اپنے بارے میں بڑا گھمنڈ کیا اور طغیان وسرکشی میں حد سے گزر گئے۔

(۲) اہل کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ آسمان سے ایک کتاب ان پر یکبارگی نازل کردو (یہ تو صرف ایک بہانہ ہے) کیونکہ حضرت موسیٰ سے انہوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا، کہ ہمیں ظاہر بظاہر خدا کی دید کراؤ، اس ظلم اور غلط روش کے سبب آسمانی بجلی نے اُنہیں آلیا۔ پھر باوجود کہ ان کے لیے روشن دلائل آچکے تھے، انہوں نے گوسالۂ سامری کو اپنا معبود بنایا، لیکن ہم نے ان کو معاف کردیا اور موسیٰ کو واضح برتری عطا فرمائی۔

(۳) فرعون نے کہا اے زعماء دربار! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی اور خدا کو نہیں جانتا (لیکن تحقیق مزید کی خاطر) اے ہامان میرے لیے زمین پر آگ جلاؤ (اینٹیں پکاؤ) پھر میرے لیے ایک بڑا بُرج بنادو تاکہ میں موسیٰؑ کے خدا کا پتہ چلاؤں۔ اگرچہ مجھے گمان ہے کہ موسیٰ جھوٹے ہیں۔

(۴) انہوں نے کہا کہ ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔ جب تک تو ہمارے لیے (بنجر) زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کردے یا ہم پر آسمان سے سنگریزے گرادے، جیسا کہ تیرا خیال ہے یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ۔

(۵) بہت سے واضح دلائل کے باوجود) کیا وہ مشرک انتظار کررہے ہیں کہ خدا اور فرشتے بادلوں

کے سائے میں ان کے پاس آئیں گے (اور کوئی نئی دلیل دیں گے) جبکہ معاملہ انجام پاچکا اور تمام امور کی بازگشت خدا کی طرف ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

ہم خدا کو کیوں نہیں دیکھ سکتے:

(۱) پہلی آیت میں کافر ومشرک لوگوں کا قول نقل کیا گیا ہے۔ وہ لوگ یہ خیال کرتے تھے خدا جسم رکھتا ہے اور وہ قابل مشاہدہ ورویت ہے..... ارشاد ہوا: جولوگ ہمارے حضور پیش ہونے کی فکر نہیں رکھتے۔ وہ کہتے ہیں کیوں فرشتے ہمارے پاس نہیں آتے (تاکہ ہم پیغام حق کو خود سنیں اور وہ پیغمبر کے گواہ ہوں) یا ہم اپنے پروردگار کو ان آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے (وقال الذین لا یرجون لقآء نالولا اُنزل علینا الملیکة اونریٰ ربنا)۔

ان لوگوں نے پہلے تو فرشہ وحی کے مشاہدے کا تقاضا کیا پھر اس سے بھی آگے نکلے اور خدا کو دیکھنے کا اظہار کرنے لگے، گویا غیر محسوس اور غیر مجسم خدا ان کے لیے قابل قبول نہیں تھا معلوم ہوتا ہے کہ بائیں شرک وبت پرستی کے پیشواؤں کی طرف سے ہوتی تھیں جو حقیقت امر کو تو جانتے تھے لیکن عوام الناس کو غافل رکھنے کے لیے سب چیزوں کو حس ومشاہدے کی چاردیواری میں بند کردیتے تھے۔ وہ اس طرح کی باتیں پیغمبر اکرمؐ کے سامنے کیا کرتے تاکہ اپنے گمان کے مطابق انہیں شکست دیں لہٰذا قرآن نے انہیں ان الفاظ میں یاد کیا کہ وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور انہیں کسی باز پرس کا احساس ہی نہیں ہے اس لیے آیت کے آخر میں ارشاد ہوا: انہوں نے اپنے بارے میں بڑا گھمنڈ کیا اور طغیان وسرکشی میں حد سے گزر گئے۔ (لقد استکبروا فی انفسھم وعتو عتواً کبیراً)

مفسرین نے آیت زیر بحث کے بعد اس سلسلے کی آیتوں میں آیت ۲۷ کے نشان نزول میں کہا ہے کہ یہ مشرک سرداران قریش کے بارے میں نازل ہوئی۔

بہرحال آیت زیرِ بحث کے ذیل میں یہ بات واضح ہورہی ہے کہ ان لوگوں کے اس بہت بڑے مطالبے کا سبب ایک تو ان کا تکبر وغرور تھا۔ دوسرے ان کا طغیان وسرکشی کہ جس میں عناد وعداوت بھی شامل ہے اسی لیے انہوں نے فرمانِ حق سے روگرانی کی تھی یہ صرف مشرکین عرب ہی کا معاملہ نہیں، بلکہ آج بھی مغرور وسرکش ماہرین علوم عصریہ تصوّر رکھتے ہیں۔ کہ ہر چیز کو تجربی لحاظ سے دیکھا جائے۔ یعنی حسی تجربے کے بغیر کوئی چیز قابل تسلیم نہیں ہے، چنانچہ وہ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ جب تک خدا کو آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ ہم اس کا یقین واعتقاد نہیں کریں گے۔ اس لحاظ سے قدیم وجدید مشرکین کے یہ دونوں گروہ تکبر وغرور میں اندھے ہوکر حس ومادہ کی چاردیواری میں بند ہوکر رہ گئے ہیں حالانکہ حس ووجود اور مادہ ومادیات کے علاوہ کئی عوالم وجود رکھتے ہیں جو صرف دل کی آنکھوں سے ہیں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اور خدا بھی حواس کی بجائے دل ہی میں آنے والی ذات ہے۔

یہی سوال حضرت موسیٰ سے کیا گیا:

(۲) دوسری آیت میں یہود کے حیلے بہانوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اہل کتاب تم سے تقاضا کرتے ہیں کہ آسمان سے ایک کتاب ان پر ایک بارگی نازل کردو۔(یسئلك اهل الكتاب ان تنزل عليهم كتاباً من السمآءِ)اس جملے کی تفسیر میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہاں ان لوگوں کی طرف سے طلب کی گئی کتاب سے مراد اوراق کی صورت میں تحریر ہے جس کو وہ آنکھوں سے دیکھیں اور ہاتھوں سے مس کریں[1]

بجلی نے انہیں آلیا(فاخذتهم الصعقة بظلمهم) ہاں تو ان لوگوں نے بہانے تلاش کر کے اپنے اوپر ظلم کیا، اپنی عقل کو حس وتجربہ کی چار دیواری میں بند کر دیا اور اسے موقع نہ دیا کہ وہ اس محدود دنیا کے علاوہ حقائق کے وسیع عالم کی طرف پرواز کرے۔ اس وجہ سے ان پر آسمانی بجلی گری اور وہ نابود ہو گئے آخر کار حضرت موسیٰ کی دعا سے دوبارہ زندہ ہو گئے۔

لیکن یہ حیرت اور تعجب کی بات ہے کہ آسمانی بجلی گرنے کے اس خوفناک واقعہ سے گزرنے پر بھی ان کے دل ودماغ میں بیداری پیدا نہیں ہوئی اور جب سامری نے انہیں گوسالہ پرستی کی دعوت دی تو انہوں نے اسے قبول کر لیا جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہوا: پھر باوجود یکہ ان کے پاس روشن دلائل آچکے تھے۔ انہوں نے گوسالۂ سامری کو اپنا معبود بنایا(ثم اتخذوا العجل من بعدِ ما جاءتهم البينٰتُ)

گویا انہوں نے غیر محسوس اور دکھائی نہ دینے والے خدا کو تسلیم وقبول نہ کیا اور ان کی روح اس مادی دنیا کے سوا عالم مجردات کی طرف پرواز کرنے سے قاصر رہی پھر بھی لطف خداوندی ان کے شامل حال ہوا جیسا کہ آخر آیت میں آیا ہے لیکن ہم نے ان کو معاف کر دیا اور موسیٰ کو واضح برتر عطا فرمائی(فعفونا عن ذلك واتينا موسىٰ سلطاناً مبينًا)

سلطان مبین سے مراد وہ واضح سرداری ہے جو خدائے حضرت موسیٰ کو دی اور اس طرح دلیل ومنطق کے اعتبار سے مخالفین پر برتری وفوقیت عطا فرمائی، بعض مفسرین نے اسے صرف بحث واستدلال میں کامیابی قرار دیا ہے، جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں علامہ طبرسیؒ نے اسی تشریح کو اختیار کیا ہے[2]

مجھے آسمان پر جانے دو کہ خدا کو دیکھوں:

(۳) تیسری آیت میں یہی بات ہم فرعون کی زبان سے سن رہے ہیں جس سے مصر کے لوگوں کے افکار کا پتہ چلتا ہے، فرعون نے یہ گفتگو اس وقت کی جب حضرت موسیٰ کو جادوگروں پر کھلی برتری حاصل ہوئی اور ان کی شہرت مصر کے طول وعرض میں عام ہو گئی تھی۔ فرعون

---

[1] اس تفسیر کو فی ظلال القرآن جلد ۲ صفحہ ۵۸۷ پر اختیار کیا گیا ہے فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں اسے ایک قول کے عنوان سے ذکر کیا اور مناسب قرار دیا بہر حال اس آیت کی دوسری تفسیر جو یہاں درج کی گئی وہ بھی اس سے منافات نہیں رکھتی

[2] مجمع البیان جلد ۳ صفحہ ۱۳۴۔

نے سوچا کہ اب کوئی ایسی بات کی جائے کہ لوگوں کے دل و دماغ سے حضرت موسیٰ اور ان کے معجزوں کا اثر زائل ہو جائے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا: فرعون نے کہا اے زعماء دربار! میں اپنے سوا تمہارے لیے کسی اور خدا کو نہیں جانتا (وقال فرعون یاایها الملاما علمیت لکم من الہٍ غیری [1])

مگر اس لیے کہ میں اہل تحقیق ہوں لہٰذا احتیاط کا دامن نہیں چھوڑوں گا، میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے کہ جس سے موسیٰ کا صدق و کذب ظاہر ہو جائے...... اے ہامان! میرے لیے زمین پر آگ جلاؤ۔ (اینٹیں پکاؤ) پھر میرے لیے ایک بڑا برن بنا دو تا کہ میں موسیٰ کے خدا کا پتہ چلاؤں۔ (فاوقدلی یاھامان علی الطین فاجعل لی صرحاً لعلی اطلع الی الہٍ موسیٰ [2]

اگر چہ مجھے گمان ہے کہ موسیٰ جھوٹے ہیں (وانی لاظنهٔ من الکذبین)۔

اس میں شک نہیں کہ فرعون بڑا ہوشیار آدمی تھا، اس لیے ممکن نہیں کہ وہ اس بات کو سمجھ نہ رہا ہو کہ وہ خدا نہیں ہے اسی طرح وہ یہ بھی جانتا تھا کہ خداوند آسمان کہنے میں موسیٰ کی مراد یہ ہے کہ خدا خالق آسمان ہے۔ نہ یہ کہ خدا آسمان پر رہتا ہے۔ بالفرض اگر آسمان ہی خدا کی جائے سکونت ہو تو پھر بھی ایک بلند سے بلند مینار کے ذریعے بھی وہاں پہنچا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ اونچے مقام پر سے آسمان کی بلندی ایسی ہی نظر آتی ہے۔ جیسی زمین سے نظر آتی ہے یہ ایسے مسائل نہیں تھے جو فرعون کے علم میں نہ ہوں یا وہ انہیں سمجھتا نہ ہو۔

لیکن فرعون کا مقصد کچھ اور تھا...... وہ چاہتا تھا کہ اس طرح کے مسائل پیدا کر کے لوگوں کے افکار و خیالات کو منتشر کر دے جو حضرت موسیٰ کی طرف جھکے جا رہے تھے۔ چنانچہ اس کا ارادہ ہوا کہ ایک بلند مینار کی تعمیر شروع کر دینے سے وہ عوام کو بہت مدت تک اس میں مشغول رکھ سے گا۔ جب سینکڑوں افراد اس پر کام کر کے مال و دولت بھی کمائیں گے پھر جب یہ مینار بن چکے گا تو وہ خود اس کی بلندی تک پہنچے گا۔ اور واپس آ کر بتائے گا کہ مینار کے اوپر جا کر بھی مجھے موسیٰ علیہ السلام کے خدا کا کوئی نشان نہیں ملا۔ تاہم ان سب باتوں سے ایک چیز واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مصر کے عوام کے افکار کتنے پست تھے۔ کہ وہ محسوس ہونے اور نظر آنے والے خدا کے سوا کسی ان دیکھے اور حقیقی خدا کے وجود کو باور ہی نہیں کرتے تھے جس طرح وہ فرعون کو اپنا آلہ و رب مان رہے تھے اس طرح یہ خیال کرتے تھے کہ موسیٰؑ کا خدا بھی ظاہری و مادی جسم رکھنے والا اور اس آسمان کی بلندیوں پر مقیم ہوگا...... ظاہر ہے کہ ایسے معاشرے اور ماحول میں بت سازی اور بت پرستی کا رواج ہوتا ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں مشرکوں کی گفتگو، حیلے بہانے اور عجیب و غریب اعتراضات ہیں جو وہ رسول اکرمؐ پر وارد کرتے تھے...... قرآن کہتا ہے انہوں نے کہا ہم تجھ پر ہرگز ایمان نہیں لائے گے۔ جب تک تو ہمارے لیے (بنجر) زمین سے ایک چشمہ جاری نہ کر دے۔

(وقالولن نومن لك حتیٰ تفجر لنا من الارض ینبوعاً [3])

---

[1] صاحبانِ لغت کہتے ہیں کہ لفظ ''ملاء'' اس گروہ پر بولا جاتا ہے، جن کا عقیدہ ایک ہو اور ان کا ظاہر آنکھوں کو پُر کر رہا ہو۔ اس کا مادہ ''ملا'' بروزن ''مرد'' ہے اور اس کے معنی پر ہانا ہے اس لیے یہ لفظ ایک قوم کے روساء اور بادشاہ کے درباریوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

[2] ''صرح'' کھوٹ سے پاک، پھر اس کا اطلاق بلند و بالا محلات پر ہوا، اس طرح کہ محل کو ایسا مکمل بنایا جس میں کوئی نقص و عیب نہیں۔

[3] ینبوع کا مادہ نبع بروزن طبع ہے جس کا معنی چشمہ آب ہے۔

بعض مشرکین نے ایک اور بہانہ تراشا اور کہنے لگے: یا ہم پر آسمان سے سنگریزے گرادے جیسا کہ تیرا خیال ہے (اوتسقط اسماء کما زعمت علینا کسفاً)..... یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آ (اوتاتی باللہ والملآئکۃِ قبیلاً[1])

ان مشرکوں کا آخری تقاضا واضح طور پر بتا رہا ہے کہ یہ لوگ خدا کی جسمیت کے قائل ومعتقد تھے اور وہ چہار دانگ عالم میں جسم و مادہ کے علاوہ کسی کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، بعض مفسرین کا خیال ہے کہ فرشتوں کی آمد کے سوال میں ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ وہ آئیں اور خدا کی مدد کریں[2] یا یہ کہ فرشتے آ کر خدا کی الوہیت کی گواہی دیں اس سے بخوبی واضح ہو رہا ہے کہ ان بہانہ تراشیوں کے سلسلے میں ان لوگوں کے فکر وخیال کس قدر پست اور لغو تھے۔

وہ منتظر ہیں کہ خدا ان کے پاس آئے:

(۵) یہاں تک کہ پانچویں اور آخری آیت میں مشرکوں اور کافروں کے پست خیالات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: کیا وہ مشرک انتظار کر رہے ہیں کہ خدا اور فرشتے بادلوں کے سائے میں ان کے پاس آئیں گے۔ (ھل ینظرون الا ان یاتیھم اللہ فی ظللٍ من الغما مو الملئکۃُ)[3]

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے بڑے ہاتھ پاؤں مارے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت متشابہات میں سے ہے اور اس کی تفسیر محکمات کے مطابق کی جانی چاہیے[4]

اس کے علاوہ بعض مفسروں نے اس آیت کی سات مختلف تفسیریں بیان کی ہیں[5]

گویا اس آیت کے بارے میں ان کا تصور کچھ اس طرح کا تھا کہ ایک دن ایسا بھی ہوگا۔ جب خدائے تعالیٰ اور اس کے فرشتے بادلوں کے سائے میں زمین پر اُتر پڑیں گے لیکن یہ بات قرآن کی آیتِ صریحہ کے خلاف ہے۔ (کہ خدا جسم وجسمانیات سے مبرا و پاک ہے) لہٰذا اس کی کوئی مناسب حال تاویل ہونی چاہیے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا مفہوم ومطلب ان خیال آرائیوں سے یکسر جدا اور الگ ہے چنانچہ اس میں انکار استفہامی کی صورت میں بات کی گئی ہے۔ مثلاً اس طرح کہ کچھ لوگ حصولِ علم میں سستی کرتے ہوں اور آپ ان سے کہیں کہ کیا تمہیں اس وقت کا انتظار ہے کہ علم لقمہ کی صورت میں تمہارے منہ میں ڈالا جائے گا؟

---

[1] لفظ قبیل کبھی بمعنی مقابل کفیل، شاہد اور کبھی جماعت وگروہ کے معنی ہیں استعمال ہوا ہے اور آیت میں تینوں معنی قابلِ قبول ہیں۔

[2] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۵ صفحہ ۳۵۹۔

[3] مفسرین کا اتفاق ہے کہ ''نظر'' کے معانی میں ایک معنی ''انتظار'' بھی ہے (تفسیر فخر رازی جلد ۵ صفحہ ۲۱۲)

[4] تفسیر المیزان جلد ۲ صفحہ ۱۰۵۔

[5] تفسیر فخر رازی جلد ۵ صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۶۔

مذکورہ آیت بھی یہی کہہ رہی ہے..... کیا ان کو انتظار ہے کہ خدا وفرشتے ان کی ملاقات کو آئیں گے اور ان کے سامنے کھڑے ہوکر گواہی دیں گے؟ ان کا یہ انتظار کس قدر بے بنیاد اور نادرست ہے کہ خدا کا جسم ومکان کا جسم ومکان اور اس کی آمدورفت تو ممکن ہی نہیں ہے پس اس آیت کا مفہوم واضح اور صاف ہے اور اس میں کسی پیچیدہ اور دقیق تفسیر کی قطعاً ضرورت نہیں اور نہ اسے متشابہات میں شمار کرنے کی حاجت ہے۔

آخر آیت میں اس بہانہ ساز گروہ کی تہدید کے لیے کہا گیا..... یہ امر اپنے انجام کی پہنچ گیا (وَ قضی الامر) اور ان لوگوں کو یقیناً سزا ملے گی گویا کہ وہ انہیں مل چکی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس جملے میں فعل ماضی استعمال کیا گیا ہے پھر فرمایا: اور تمام کاموں کی بازگشت خدا ہی کی طرف ہے (والی اللہ تُرجع الامور)

خدا کے مقابل کسی شخص کی کوئی طاقت وہمت نہیں اور نہ اس کے حکم کے سامنے کسی سرتابی کی مجال ہے لہٰذا جب وہ کسی گروہ کو سزا دینے کا ارادہ کرے تو گویا وہ واقع ہوگئی کیونکہ کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔ آیا سزا دیتے جانے کی یہ دھمکی قیامت سے تعلق رکھتی ہے یا اس دُنیا یا ان دونوں سے تعلق رکھتی ہے؟ یہ امر بعید نہیں کہ یہ سزا دنیا وآخرت دونوں ہی سے تعلق رکھتی ہو۔ کیونکہ آیت کے مفہوم میں وسعت ہے اور اس کے محض دنیا یا آخرت تک محدود ہونے کی کوئی دلیل نظر نہیں آتی۔

ان پانچوں آیات کی تفسیر میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ طول تاریخ میں انبیاء سابق کی قوموں کے محسوس معبودوں کی طرف میلان کے نتیجے میں وہ نقطہ توحید سے ہٹ کر عقیدۂ شرک سے وابستہ ہوتی رہی ہیں، یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا پھر وہ قومیں جو علمی وفکری لحاظ سے پسماندہ تھیں۔ یا طاغوتوں اور منکرین خدا کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے باعث خدا شناسی کو محسوسات ہی میں منحصر سمجھتی تھیں..... انہوں نے فطرت خدا شناسی کا رُخ خود ساختہ خداؤں اور قسم قسم کے بتوں کی طرف موڑ دیا تھا..... چنانچہ تاریخ انسان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیدہ شرک کا سب سے بڑا عامل یہی رہا ہے کہ لوگ وجود کو صرف محسوس وجود کا تصور ان کے دل ودماغ میں سماتا ہی نہ تھا۔

توضیحات

صرف عالمِ محسوسات ہی پر کیوں تکیہ کرتے ہیں؟

یہ ایک واضح بات ہے کہ ابتدائی طور پر انسانی معلومات کی بنیاد حس وحواس پر ہی ہوتی ہے، جب ایک انسان پہلی بار آنکھ کھولتا ہے تو اس کی نظر اس مادی دُنیا پر پڑتی ہے اور وہ اس عالمِ محسوسات سے آشنا ہوتا ہے۔ اس کی توجہ ماوراء حواس موجودات کی طرف سے وقت ہوگی۔ جب وہ مسائل عقلی وفکری اور معاملاتِ روحانی کا تجزیہ وتحلیل کرے گا وگرنہ وہ ایک ایسے وجود کا تصور نہیں کرسکے گا۔ جو مادہ ومدیات اور زبان ومکان سے مبرا ہو اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فکری وعلمی طور پر پسماندہ قوموں نے بت پرستی کو اپنا مذہب بنا رکھا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کی فطرت انہیں خدا پرستی کی سمت بلا رہی ہے معرفت خدا کا جاذبہ انہیں دعوت دے رہا ہے اور

دوسری طرف وہ اس جہان میں محسوسات و مادیات کا غلبہ دیکھ رہے ہیں اس لیے زبان و مکان سے مبرا خدا کی معرفت ان کے لیے مشکل ہوجاتی ہے۔ پس وہ بت پرستی کی طرف قدم بڑھاتے ہیں اور اپنی پیاسی روح کو خیالی معبودوں اور مندروں کے مہنت اور اکثر حاکمان طاغوت بت پرستی کی رسوم سے مالی فائدے حاصل کرتے ہیں اس لیے وہ بھی ان خیالات کو عام کرتے اور آگے بڑھاتے ہیں بلکہ وہ بت سازی و بت پرستی کو اپنے ملک کا سرکاری مذہب بناڈالتے ہیں اور اس کو ترقی دیتے ہیں۔

حقیقت میں یہ بڑی عجیب بات ہے کہ بعض قائلین توحید بھی ان خیالات سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ مثلاً عام لوگ قسم کھاتے وقت کہتے ہیں کہ اس خدا کی قسم جو آسمان میں ہے یا دعا مانگتے ہوئے اپنے ہاتھ اور چہرہ آسمان کی طرف بلند کرتے ہیں..... گویا کہ ایسے خدا کی طرف اشارہ کررہے ہوں جو آسمان میں رہتا ہے اور فرشتے اس کے چاروں طرف کھڑے رہتے ہیں لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ خدائے تعالیٰ آسمان میں سکونت پذیر نہیں ہے وہ نہیں جانتے کہ ہاتھوں کو بلند کرنے کی وجہ یہ نہیں کہ خدا وہاں رہتا ہے بلکہ یہ عاجزی اور بے چارگی کی علامت ہے یا جیسا کہ روایات میں ہے کہ وقت دعا ہاتھوں کو اس لیے بلند کیا جاتا ہے کہ تمام نعمتیں آسمان ہی سے آتی ہیں۔ مثال کے طور پر بارانِ رحمت اور سورج کی روشنی کہ جو انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں..... گویا آسمان کی طرف توجہ خالق کی معنوی بلندی کی طرف توجہ کرنے کے مترادف ہے۔

بہرحال جب تک فکر انسانی میں بلندی نہ آئے۔ اس وقت تک اس کا شرک سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے۔

مقام غور ہے کہ بنی اسرائیل جن کی تربیت ایک طویل مدت تک حضرت موسیٰؑ ایسے اولوالعزم پیغمبر کے مکتب توحید میں ہوئی۔ انہوں نے فرعون سے نجات اور دریائے نیل کا معجزانہ عبور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا..... اس کے باوجود جب وہ بت پرستوں کے قریب سے گزرے اور بتوں پر نظر پڑی تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے لیے بھی ایسے ہی بت بنوائیں۔ ان کی اس بے ہودہ خواہش پر حضرت موسیٰؑ سخت ناراض ہوئے تو وہ لوگ خاموش ہوگئے۔

لیکن اس واقعہ پر کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ حضرت موسیٰؑ الواح توریت لینے کے لیے کوہِ طور پر چلے گئے ایسے میں سامری نے ایک بچھڑے کا بُت بنایا اور بنی اسرائیل کو اس کی پرستش کرنے کی دعوت دی تو اکثریت نے توحید کو چھوڑ کر گوسالہ پرستی شروع کردی بس ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ حضرت ہارون کی قیادت میں نظریہ توحید پر قائم رہا۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علمی و فکری لحاظ سے پسماندہ اقوام میں خدائے تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رہبر کیسی کیسی مشکلات میں گرفتار رہے۔ اصولاً شرک کے آثار کو مٹانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے لوگوں کے فکر و نظر کو بلند کرنا اور انہیں صحیح تربیت دینا بہت ضروری ہے۔

شرک کا تیسرا سرچشمہ خیالی فوائد ومنافع

اشارہ:

وہم وخیال اور غلط فہمی وغرور وہ چیزیں ہیں جن پر بت پرستی کی بنیادیں قائم ہوتی تو ہم پرستی اور ضدیت جتنی زیادہ ہوگی بت پرستی کے آثار ونتائج کا دامن اتنا ہی وسیع ہوگا۔ یہاں تک کہ بے جان اور بے شعور موجودات یعنی مٹی اور پتھر کے بت اور چوب وآہن سے بناء ہوئے مجسمے اتنی قدر و قیمت کے لائق سمجھے جاتے ہیں کہ انہیں زمین وآسمان میں تمام قدرتوں کے مالک تصور کیا جاتا ہے۔ اور ان کی خیالی قوتوں کے آگے سر جھکائے اور ماتھے ٹیکے جاتے ہیں۔

ہاں بتوں سے حاصل ہونے والی خیالی برکتیں اور فرضی فائدے بت پرستی کے سرچشموں میں سے دوسرا سرچشمہ ہیں اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوتے اور آیاتِ ذیل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۱) وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾ [۱۰:۱۸] (یونس)

(۲) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۷۴﴾ [۳۶:۷۴] (یٰس)

(۳) وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ [۱۹:۸۱] (مریم)

(۴) اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ﴿۳﴾ [۳۹:۳] (زمر)

ترجمہ:

(۱) وہ خدا کے بجائے کچھ چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ نفع دیتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ خدا کے ہاں ہمارے شفیع وسفارشی ہیں، کہو..... کیا تم خدا کو زمین وآسمان میں ایسی چیز کی خبر دیتے ہو کہ جسے وہ نہیں جانتا؟ وہ ان شریکوں سے پاک ومنزہ ہے جو

وہ اس کے لیے قرار دیتے ہیں۔

(۲) انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ اور معبود بنا رکھے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید ان کی مدد کی جائے گی۔

(۳) انہوں نے اپنے لیے خدا کے سوا معبود بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کی عزّت کا ذریعہ بنیں۔

(۴) آ گاہ رہو کہ دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے وہ لوگ جنہوں نے خد کے علاوہ اپنے کچھ سرپرست قرار دیئے ہیں، وہ کہتے ہیں ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر اس لیے کہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک کر دیں گے، جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے قیامت کے روز خدائے تعالیٰ ان کے درمیان اس کا فیصلہ کر دے گا۔ بیشک خدا جھوٹوں اور کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔

مفردات کی تشریح:

''شفعاء'' شفیع کی جمع ہے، اس کا مادہ ''شفع'' بروزن ''نفع'' ہے مصباح اللغۃ کے بقول اس کا معنی ایک چیز کو دوسری میں ضم کرنا اور ملانا ہے۔ مفردات راغب کے مطابق اس کا مطلب ایک چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملانا ہے۔ مقابیس اللغۃ میں ہے کہ اس کا معنی دو چیزوں میں قرب ونزدیکی ہے۔

بہر حال ان سب معانی کی بازگشت ایک معنی کی طرف ہے، اب اس لفظ کا استعمال ایک کمزور فرد کا کسی طاقت ور شخص کے ساتھ تمسک کرنے کے معنی میں ہے تا کہ وہ اس کی مدد کرے اور اس کے لیے نجات کا وسیلہ بنے، آیت زیر بحث اور دیگر آیات میں یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے۔

عدد ''شفع'' بہ بمعنی زوج بہ مقابل ''وتر'' بمعنی فرد کے آتا ہے۔

''زلفی'' کا مادہ ''زلف'' بروزن ''ظرف'' ہے اور اس کا اطلاق درجہ منزلت میں قرب پر ہوتا ہے کبھی اسے ''قدم'' کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے کیونکہ قدم اٹھانے سے مقصد ومنزل قریب تر آتی ہے۔ آیات زیرِ بحث میں اس سے قرب معنوی بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور مشرکین بتوں کے ذریعے ایسا ہی قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن بعض محققین کے نزدیک ''زلفی'' کا معنی قرب کامل ہے جس کا مطلب قرب کا بلند ترین مقام حاصل کرنا ہے۔[1]

مگر اس مقام پر اس لفظ کے استعمال کے پیشِ نظر اس کا یہ مفہوم بعید نظر آتا ہے۔

---

[1] التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

یہ لفظ رات کی پہلی ساعتوں کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے اقم الصلوٰۃ طرفی النھار وزلفاً من اللیل۔ یعنی نماز دن کے دونوں سروں اور رات کے اوائل میں قائم کرو۔'' (ہود۔ ۱۱۴)

آیات کی جمع آوری وتفسیر

بت ہمارے شفیع ہیں:

(۱) پہلی آیت میں بت پرستوں کے مشہور مفروضے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوا: یہ لوگ خدا کے بجائے کچھ چیزوں (بتوں) کی پوجا کرتے ہیں جو نہ انہیں نقصان پہنچاتی ہیں اور نہ نفع دیتی ہیں اور وہ کہتے ہیں یہ خدا کے ہاں ہمارے شفیع وسفارشی ہیں۔ گویا قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں (ویعبدون من دون اللہ مالا یضرھم ولا ینفعھم ویقولون ھولاءِ شفعآؤنا عنداللہ۔)

اب ایک سوال سامنے آتا ہے کہ وہ لوگ ان بے جان مجسموں کو کیونکر درگاہ خداوندی میں اپنا شفیع وسفارشی سمجھ رہے تھے؟ اس کے جواب میں بعض مفکرین کا خیال ہے کہ مشرکین کا اعتقاد یہ تھا کہ بتوں کی پوجا خدا ہی کی عبادت ہے اور اس کے تقرب کا ذریعہ ہے..... یہ عقیدہ مختلف وجوہات کی بناء پر پیدا ہوا تھا۔

ایک گروہ کا خیال تھا کہ ہم خدا کی عبادت کرنے کے لائق نہیں۔ لائق نہیں کیونکہ وہ بڑی بلند وبرتر ذات ہے۔ اس لیے ہم ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں تا کہ ان کے واسطے سے ہم اس کے نزدیک ہوسکیں۔ بعض کو سوچ یہ تھی کہ فرشتے خدا کی بارگاہ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ہم اس لیے بتوں کی پوجا کرتے ہیں کہ یہ ان کے مظہر ہیں ہم فرشتوں کی مورتیوں کو پوجتے ہیں تا کہ ان کے وسیلے سے قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔

کچھ مشرکین کہا کرتے کہ ہم خدا ہی کی عبادت کرتے ہیں اور یہ بت ہمارے لیے بمنزلہ قبلہ کے ہیں۔ جیسے مسلمان عبادت کے وقت اپنے قبلہ کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ جب کہ بعض یہ کہتے ہیں کہ ہر بت کے پاس ایک شیطان ہوتا ہے ہم بتوں کی پوجا کرتے ہیں تو وہ شیطان ہماری مراد پوری کر دیتا ہے۔..... اگر بتوں کی پوجا نہ کی جائے وہی شیطان خدا کے حکم سے انسان کو گمراہ اور بدبخت بنا دیتا ہے اسی طرح کے اور بھی خرافات ہیں جن کے لوگ قائل ہیں[1]

(۲) دوسری آیت میں مشرکین کے ایک اور مفروضے کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: انہوں نے اپنے لیے خدا کے علاوہ کچھ معبود بنا رکھے ہیں۔ اس امید پر کہ شاید ان کی مدد کی جائے گی (واتخذوا من دون اللہ الھۃ لعلھم ینصرون)۔

وہ تمنا رکھتے تھے کہ یہ بت مشکلوں مصیبتوں اور جنگوں بیماریوں میں ان کی مدد کریں، قحط اور خشک سالی میں وہ ان کی فریاد کو پہنچیں اور عالم آخرت میں ان کے حمایتی بن کر آئیں..... یہ ان لوگوں کی کتنی بڑی غلط فہمی تھی۔ لیکن معاملہ بالکل الٹ ہو گیا کیونکہ بتوں کو کسی طرح

---

[1] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۱۹۷۔

کا خطرہ ہوتا تو یہ لوگ خود ان کی مدد کو دوڑ پڑتے اور ان کے دشمنوں سے ان کا دفاع کرتے تھے، جیسے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں آیا ہے: قالوا حرقوهُ وانصروا الهتكم ان كنتم فاعلين ۔یعنی انہوں نے کہا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ اگر تم کوئی کام کرنے والے ہو۔(انبیا۔٦٨)

ان کا یہ عقیدہ کہ بت ان کی مدد کریں گے ایک وہم وخیال سے زیادہ کچھ نہ تھا کیونکہ اس کی اصل واساس علمی پسماندگی اور فکری پستی ہے۔یہی وہ چیز ہے جو طول تاریخ میں بت پرستی کی نمود کا سرچشمہ رہی ہے۔

(۳) تیسری آیت میں یہی معاملہ ایک اور انداز میں بیان ہوا ہے۔جیسا کہ فرمایا گیا: انہوں نے اپنے لیے خدا کے سوا کچھ معبود بنا رکھے ہیں تا کہ وہ ان کی عزت کا ذریعہ بنیں (واتخذوا من دونِ الله الهة ليكونوا لهم عزاً)

عزت سے مرتبہ وحیثیت ہی نہیں بلکہ قوت، نصرت اور خدا کے ہاں شفاعت مراد ہے۔یہ بھی محض ان کا خیال ہی ہے کیونکہ اس آیت کو جاری رکھتے ہوئے اسی سورہ (مریم) میں فرمایا ہے: جب اوہام کے پردے اُٹھیں گے تو عقل کی حکومت ہوگی اور بت پرستوں کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوگا وہ ان بتوں کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔جیسے سورۂ انعام کی آیت ۲۳ رمیں ہے کہ قیامت کے روز بت پرست کہیں گے (والله ربنا ما كنا مشركين) قسم اس خدا کی جو ہمارا پروردگار ہے کہ ہم مشرک نہ تھے۔

(۴) چوتھی اور آخری آیت میں (الا لله الدين الخالص) خالص دین خدا ہی کے لیے ہے کا اعلان کرنے کے بعد مشرکوں کو دھمکی دیتے ہوئے فرمایا: وہ لوگ جنہوں نے خدا کے علاوہ اپنے کچھ سرپرست قرار دے رکھے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔ہم ان کی پرستش نہیں کرتے مگر اس لیے کہ وہ ہمیں خدا کے نزدیک کر دیں گے جس چیز میں وہ اختلاف کرتے تھے خدائے تعالیٰ قیامت کے روز ان کے درمیان اس کا فیصلہ کر دے گا، بے شک خدا جھوٹوں اور کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔(والذين اتخذو امن دونه اولياءُ ما نعبدوهم الا ليقربونا الى الله زُلفى ان الله يحكم بينهم فيما هم فيه يختلفون ان الله لا يهدى من هو كاذِب كفارٌ[1])

توضیحات

۱۔مفروضہ شفاعت کا سرچشمہ

بت پرستی کے فعل کو دیکھ کر ہر عقلمند انسان حیران رہ جاتا ہے کہ یہ کیونکہ ممکن ہے کہ ایک عاقل شخص مٹی اور پتھر کے بتوں کے سامنے سر

---

[1] بہت سے مفسرین کا کہنا ہے کہ والذین'' مبتداء ہے اور ان الله يحكم بينهم'' اس کی خبر ہے۔نیز جملہ ما نعبدوھم میں ایک محذوف ہے جو بمنزلہ حال کے ہے۔ (قائلين ما نعبدهم)

جھکائے (جواس نے خود ہی بنائے ہوں) اگر معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس پر غور کرے تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا کہ بت پرستی ایک احمقانہ عمل ہے لیکن جب ہم اس کے اسباب وعلل پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ محض سطحی سا نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ خیال، اوہام، عادات اور غلط فہمیاں عقلی دلائل کے طور پر سامنے آتی ہیں جن سے لوگ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔

فخر الدین رازی سورہ یونس کی آیت ۱۸ کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں کس طرح بتوں کو بارگاہ الٰہی میں شفیع تصور کیا گیا؟ اس کی تحلیل میں کئی ایک اقوال نقل کیے ہیں۔

(۱) ایک گروہ کا اعتقاد ہے کہ دنیا کی ولایات وممالک میں ہر ولایت وملک کی سرپرست ایک روح ہوتی ہے چونکہ ہر روح تک رسائی (ان کے بقول) ممکن نہیں ہے اس لئے بت بنا کر انہیں اس روح کا مظہر قرار دیا گیا اور ان کی عبادت شروع کر دی گئی جب کہ اصلاً اسی روح کی عبادت کی جارہی ہے پھر یہ خیال باندھ لیا گیا کہ یہ روح خدا کی مطیع اور اس کی عبادت گزار ہے۔

(۲) ایک اور گروہ ستارہ پرستی کرتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں ستارے ہی خدا کی عبادت کرنے کے اہل ہیں نہ کہ خود وہ لوگ.....اور جب انہوں نے دیکھا کہ ستارے ہمہ وقت موجود نہیں رہتے کہ ان میں طلوع وغروب کا سلسلہ جاری ہے، تب ان لوگوں نے ہر ستارے کی ایک شکل قرار دے کر اس کے نام پر بت بنالیا اور ان بتوں کی پوجا کرنے لگ گئے جب کہ اصل میں وہ ان ستاروں کی پرستش تھی۔

(۳) ہر بت کے لیے ایک خاص طلسم ہے۔ یعنی نقش بناتے اور وہ اس کے سامنے پیش کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس نقش کے ذریعے ان کو اس بت کا قرب حاصل ہوتا ہے طلسم سحر وجادو کی ایک قسم ہے، اس میں پڑھے جانے والے افسوس اور نقوش واشکال شامل ہیں ،بعض لوگوں کا نظریہ ہے۔ کہ ان طلسمات کے وسیلے سے آسمانی قوتیں زمین پر اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کی عجیب وغریب اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ لوگ مختلف چیزوں پر یہ نقوش بناتے ہیں اور یہ تصور کرتے تھے کہ ان کے ذریعے سے موذی جانور اور دیگر امراض وبلیات ہم سے دور رہیں گے)[1]

(۴) انبیاء اولیاء کی مزعومہ صورتوں کے بت بنائے گئے اور وہ اس امید پر ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے کہ وہ خدا کے حضور ہماری شفاعت وسفارش کریں گے۔

(۵) وہ لوگ یہ تصور رکھتے تھے کہ خدا ایک بزرگ تر نور ہے اور فرشتے چھوٹے چھوٹے انوار ہیں لہٰذا وہ خدا کو ایک بہت بڑے بت کی صورت میں مجسم کرتے اور فرشتوں کے ناموں پر کئی چھوٹے بت بناتے تھے۔

(۶) بت پرستوں میں سے بعض لوگ حلول کا نظریہ رکھتے تھے۔ یعنی وہ یہ اعتقاد ظاہر کرتے کہ خدا بعض اجسام میں حلول کرتا ہے اور وہ ان بتوں میں بھی داخل ہوتا ہے.....اس لیے وہ بتوں کی پوجا کرتے تھے[2]

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ بت پرستی حضرت نوحؑ کے زمانے میں شروع ہوئی.....وہ یوں کہ حضرت نوحؑ کے پانچ بیٹے تھے، ود،

---

[1] مزید تشریح کے لیے دائرۃ المعارف، ''دہ خدا، جلد ۳۲ اور دائرۃ المعارف ''مصاحب'' جلد دوم میں مادہ ''طلسم'' کا مطالعہ کریں۔

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۱۷ صفحہ ۶۰ (معمولی تلخیص کے ساتھ)

سواع، یعوق، یغوث، نسر.....ان میں سے ''دؤ'' فوت ہوگئے تو لوگ بڑے غمگین ہوئے اور ہر وقت ان کی قبر پر بیٹھتے رہتے۔ تب شیطان نے ان سے کہا کہ آؤ میں تمہیں ''دؤ'' کا مجسمہ بنادوں کہ جب تم فرزندِ نوح کو دیکھنا چاہو تو اسے دیکھ کر اس کی یاد تازہ کرلیا کروگے، انہوں نے کہا: ہاں ایسا ہی کرو، اس وقت ابلیس نے ''دؤ'' کا مجسمہ بنایا تھا۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور حضرت نوحؑ کا جو بیٹا بھی فوت ہوتا، اس کا بت بنالیا جاتا۔ یونہی وقت گزرتا رہا اور شیطان نے ان لوگوں کو باور کرادیا کہ تمہارے بزرگ انہی بتوں کی پوجا کرتے رہے ہیں۔ لہٰذا تم بھی ایسا ہی کرتے ہو..... یہ وہ وقت تھا جب خدا نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا کہ وہ اس بت پرستی کو روکیں [1]

۲۔ عربوں میں بت پرستی کا رواج

وہ پہلا شخص جس نے اہل عرب میں بت پرستی شروع کی وہ بنوخزاعہ کا ایک فرد ''عمرو بن لحی'' تھا وہ اپنے کسی کام سے شام ہوگیا اور وہاں ہونے والی بت پرستی کو دیکھا اس نے ان لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ان بتوں کی پوجا کرتے ہیں.....ان سے بارش طلب کرتے ہیں تو بارش ہوجاتی ہے اور ان سے مدد مانگتے ہیں تو وہ مشکلوں میں ان کی مدد کرتے ہیں۔

عمرو بن لحی نے اہل شام سے کہا، اگر ممکن ہو تو ایک بت مجھے بھی دو۔ تاکہ عرب کے لوگ بھی بُت پرستی سے نفع حاصل کریں انہوں نے اسے ایک بت ''ہبل'' دیا جو انسانی شکل میں تھا اور عقیق سے بنایا گیا تھا۔ وہ یہ بت لے کر شام سے مکہ پہنچا اور اسے کعبہ کے اندر نصب کرکے لوگوں کو اس کی عبادت پر آمادہ کیا۔ اب صورت حال یہ ہوگئی کہ سفر سے واپس آنے والے افراد پہلے ان بتوں کی زیارت کرتے اور پھر اپنے گھروں کو جاتے تھے [2]

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بت پرستی کا اصل سبب یہ ہے کہ ان وقتوں میں افراد انسانی کے نزدیک خدا کی ذات اس سے بلند و برتر تھی کہ ہم جیسے اس کی عبادت کریں۔ چنانچہ ایک درمیانی واسطہ کے طور پر بت بنائے وہ ان کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کرنا چاہتے تھے یا صورت یہ تھی کہ ان کے خیال میں خدا حواس و عقل سے ماوراء ذات ہے جس کی پرستش نہیں کیا جاسکتی۔

لہٰذا انہوں نے چاہا کہ ان محسوس موجودات (بتوں) کے وسیلے سے اس کا تقرب حاصل ہے۔

چند ایک تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ بنی اسماعیل یعنی اہل مکہ میں بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ جب ان میں سے کوئی شخص سفر پر جاتا تو مکہ سے شدید محبت کی بناء پر وہ اپنے ہمراہ وہاں سے ایک پتھر لے جاتا۔ پھر وہ جہاں جہاں قیام کرتا، اس پتھر کو سامنے رکھتا اور اس

---

[1] تفسیر روح البیان جلد ۴، صفحہ ۲۶۔

[2] روح البیان جلد ۴ صفحہ ۲۶، بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۴۸ روایت ۱، ۷، ۸ بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۲۰۰۔ عمرو بن لحی خزاعی کے شام سے نامبارک سوغات لانے کا واقعہ، سیرت ابنِ ہشام جلد اوّل صفحہ ۷۸ پر بھی اسی طرح کا واقعہ بیان ہوا ہے۔

کا طواف کر لیتا تھا۔ جیسے کعبہ کا طواف کر رہا ہو..... پھر وقت گزرنے کے ساتھ ان کی یہ عادت بت پرستی کی شکل اختیار کر گئی [1]

تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: بت پرستوں کا خیال تھا کہ ہماری بشریت، ہمارے گناہ اور ہمارے برے افعال ایسی رکاوٹیں ہیں جو ہمیں رب الارباب تک پہنچنے نہیں دیتے۔ کیونکہ اس کی ذات اعلیٰ وارفع اور پاک و پاکیزہ ہے پس ہم میں اس میں کوئی نسبت ہی نہیں..... لہٰذا ہم اس کو محبوب ترین چیزوں کے ذریعے سے اس کا تقرب حاصل کر سکتے ہیں، وہ چیزیں ہمارے وہی خدایان زمینی ہیں۔ جن کے ذمے دنیا کی خلق و تدبیر کا کام ہے پس ہم ان کی شکلیں اور مورتیاں بنا کر ان کو پوجا کریں اور ان کے نزدیک ہوں تا کہ وہ خدائے بزرگ کے ہاں ہمارے شفیع و سفارشی بنیں، اس طرح ان کی خاطر سے ہمیں خیر و فلاح حاصل ہوگی اور ضرر و تکلیف ہم سے دور رہے گی..... گویا وہ ان بتوں کی پوجا اس لیے کرتے کہ ان کے دیوتا خوش ہوں اور خدا کے ہاں ان کی سفارش کریں، کبھی وہ خود ان بتوں ہی کو شفیع و سفارشی قرار دے لیتے ہیں [2]

بہرحال ان لوگوں نے ان اوہام اور غلط اندیشیوں کے ذریعے سے اپنی گمراہیوں اور بے ہودہ رسوم کو عقلی اور منطقی طور پر درست ثابت کرنا چاہا لیکن اصل میں انہوں نے ضلالت کو ہدایت اور شیطانی وسوسوں کو عقلی دلائل کا نام دے رکھا تھا۔

(۳).....شرک و بت پرستی کے دیگر عوامل

شرک و بت پرستی ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے اور دیگر مشکل مسائل کی طرح اس کا بھی کوئی ایک عامل نہیں ہے، بلکہ یہ چیز بہت سے عوامل کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ قومیں سورج، چاند اور ستاروں کی پوجا کرتی ہیں۔ بعض اقوام آگ کی پجاری بنی ہوئی ہیں اور بعض نے بڑے دریا کو اپنا معبود بنایا، جیسے مصر میں دریائے نیل اور ہندوستان میں دریائے گنگا کو پوجا گیا۔ یعنی جس جس چیزوں کو اپنے لیے فائدہ بخش دیکھا یا اس کی بڑائی کا مشاہدہ کیا اسے مقدس قرار دے دیا اور پھر یہ تقدس..... ان کے نزدیک..... اس قدر بڑھا کہ اس چیز کے لیے رُوح خاص کے قائل ہو گئے اور اسے بھی اپنے خداؤں کی صف میں شامل کر لیا۔

ایک اور تعبیر کے مطابق شرک کرنے والے عالم اسباب میں گم ہو کر رہ گئے اور انہوں نے ان اسباب کو پیدا کرنے والے (مسبب الاسباب) خدائے واحد کو فراموش کر دیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسی نظر نہ رکھتے جو وجود کائنات کے اصل سبب تک پہنچ سکے، وہ اس فکر و فہم سے عاری تھے جو سبب کی کہنہ و اصلیت کو پا سکتی ہو..... پس ان کے مفروضوں، غلط اندیشوں اور خام خیالیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بت پرستی اور شرک میں مبتلا ہو گئے۔

---

[1] سیرت ابنِ ہشام جلد اوّل صفحہ ۷۹۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۲۷ سورہ یونسؑ۔ آیت ۱۸ء کے ذیل میں۔

شرک کا چوتھا اور پانچواں سرچشمہ
تقلید واستعمار

اشارہ:

بت پرستی کے ایک سے دوسری نسل کی طرف منتقل ہونے کا سب سے بڑا سبب تقلید ہے اور تقلید ہی کی بدولت اس میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔قرآن نے بھی بار بار یہی کہا ہے کہ بت پرستی کی نمو اور فروغ میں تقلید کا بہت بڑا حصہ ہے بلکہ بعض موقعوں پر تو اسے مشرکین عرب کی طرف سے اپنے شرک بت پرستی کی ایک مستقل دلیل کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

بت پرست معاشرے میں پرورش پانے، باپ داداؤں کا طریقہ اپنانے اور بچپن میں سُنی ہوئی باتوں سے اثر پذیر ہونے سے جیسے عوامل ایک دوسرے کے معاون بنتے ہیں تو ایک بے ہودہ اور بے بنیاد فعل یعنی لکڑی اور پتھر کے بت جو محض ناکارہ ہوتے ہیں.....انہیں ان لوگوں کی نظروں میں ایک قابلِ قدر اور مقدس وجود کے طور پر متعارف کرادیتے ہیں۔

اس اشارے کے بعد اب ہم قرآن مجید کی طرف نظر کرتے اور آیاتِ ذیل کی آواز پر کان لگاتے ہیں:

(۱) بَلْ قَالُوْٓا اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ [۴۳:۲۲]
وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ [۴۳:۲۳] (زخرف)

(۲) قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ﴿۷۱﴾ [۲۶:۷۱] قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ﴿۷۲﴾ [۲۶:۷۲] اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ﴿۷۳﴾ [۲۶:۷۳] قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ [۲۶:۷۴] (شعراء)

(۳) قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِي الْاَرْضِ ۭ وَمَا نَحْنُ لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۸﴾ [۱۰:۷۸] (یونس)

(۴) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ [۲:۱۷۰] (بقرہ)

(۵)وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ[۳۴:۴۳](سبا)[1]

ترجمہ:

(۱) بلکہ وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے آباء واجداد کو جس مذہب پر پایا ہم کو بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلنے کی ہدایت کی گئی ہے، اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا، مگر یہ کہ وہاں کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک مذہب پر پایا ہے، اور ہم انہی کے آثار کی پیروی کرتے ہیں۔

(۲) انہوں نے کہا کہ ہم بُتوں کی پوجا کرتے اور انہی کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔ اس نے کہا جب انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں یا تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا، بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا کرتے پایا ہے۔

(۳) (فرعون کے ساتھی موسیٰؑ سے) کہنے لگے کیا تو اس لے آیا ہے کہ ہمیں اس (پنتھ) سے پھیر دے جس پر ہمارے باپ دادا رہے اور تم اس ملک میں حکومت وریاست حاصل کرو، ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے۔

(۴) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں۔ ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے پر چلیں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، لیکن اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور راہ راست پر نہ رہے ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کرتے رہیں گے؟

(۵) جب ہماری واضح آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بس ایک ایسا

---

[1] ان آیات کے مضمون کے ساتھ ملتی جلتی اور بھی آیات ہیں، بوجہ اختصار ان پر اکتفاء کیا گیا ہے، ملاحظہ ہوں سورہ اعراف آیت ۷۰، ۱۷۳م سورۂ ابراہیم آیت ۱۰، سورہ ہود آیت ۶۲

شخص ہے جو تمہیں ان کی پرستش کرنے سے روکنا چاہتا ہے، جن کی پرستش تمہارے باپ دادا کیا کرتے تھے۔

مفردات کی تشریح:

''صنم'' راغب اصفہانی المفردات میں کہتا ہے کہ ''صنم'' ایسا مجسمہ ہے جسے چاندی تانبے یا لکڑی سے بناتے اور اس کی پوجا کرتے تھے، وہ لوگ اسے تقرب الٰہی کا وسیلہ تصور کرتے تھے، لسان العرب میں ہے کہ لفظ دراصل ''کلمہ'' ''شمن'' سے لیا گیا ہے جو فارسی، آرامی یا عبرانی زبان سے ہے [1]

بعض اہلِ لغت کا نظریہ ہے کہ ''صنم'' اور ''وثن'' کے درمیان فرق یہ ہے کہ ''صنم'' ان بتوں کو کہا جاتا ہے جو خاص شکل وصورت رکھتے ہیں اور ''وثن'' وہ بت ہیں جو کسی خاص شکل میں نہ ہوں۔

''اب'' یہ لفظ ''باپ'' کے معنی میں ہے، کبھی یہ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی چیز کے وجود میں آنے کا سبب ہو یا اس کی اصلاح کرے یا اسے ظاہر کرے، لیکن یہ معانی مجازی وکنائی ہیں۔ اس سبب سے کہ ''باپ'' اپنے بچوں کو روزی بہم پہنچاتا ہے اس لفظ کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے۔

کلیات ابوالوفا میں ہے پہلی شریعتوں میں لفظ ''اب'' کا اطلاق ''خدا'' پر کیا جاتا تھا۔ کیونکہ وہ اس مخلوقات کی پیدائش کا سبب ہے پھر بہت سے جاہل اور بے خبر لوگوں نے اس ''اب'' کو والدہ اور جسمانی باپ کے معنی میں قرار دے لیا اور خدا کو ''اب'' کہہ کر کفر کی راہ اختیار کر لی۔

کتاب ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں اس مادہ کو تربیت کے معنی میں استعمال کیے جانے کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس اعتبار سے اس لفظ کے مصداق بہت سے ہیں مثلاً خداوندِ متعال، والد پیغمبر، معلم، چچا اور دادا وغیرہ، پس لفظ ''اب'' میں پدر اور باپ کے معنی کے لحاظ سے بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

بت پرستی ہمارے اسلاف کا دستور ہے:

(۱) مشرکین عرب میں ایک گروہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتا اور ان کی پرستش کرتا تھا۔ پہلی آیت میں ان کے اس جاہلانہ خیال کو کئی طرح سے روک گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: تم لوگ بیٹوں کی پیدائش پر خوش ہوتے اور بیٹیوں کی ولادت پر ناراحت ہوتے ہو..... پھر خدا کے لیے بیٹیوں کے قائل کیوں ہوئے ہو؟ تاہم یہ جواب ان لوگوں کی عقل وفکر کی سطح کے مطابق دیا گیا ہے۔

---

[1] لغت فارسی ''شمن'' کے معنی بت پرست کے ہیں نہ کہ بت دیکھیں فرہنگ معین اور غیاث اللغات۔

کبھی فرشتوں اور بتوں کی پرستش پر ان کے کمزور دلائل کا ذکر کیا اور ان کا جواب دیا گیا اور آخر کار ان کی اس دلیل کا ذکر کیا ہے" بلکہ وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے آباء واجداد کو جس مذہب پر پایا ہم کو بھی انہی کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت کی گئی ہے(بل قالو انا وجدنا اٰباءَ نا علیٰ امةٍ وانا علی اثارهم مهتدون[1])

لیکن اس کے بعد قرآن بلا فاصلہ پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: یہ کورانہ تقلید اور پہلے لوگوں کے عقائد ونظریات کی بلا قید شرط پیروی نیز اس قسم کے کمزور اور بے اصل عذر صرف مشرکین عرب ہی پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ "اسی طرح ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مغرور دولت مندوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایک مذہب پر پایا ہے۔ اور ہم انہی کے آثار کی پیروی کرتے ہیں(وکذالك ما ارسلنا من قبلك فی قریةٍ من نذیرٍ الا قال مترفوها انا وجدنا اٰباءنا علی اُمةٍ وانا علیٰ اثارهم مقتدونَ)

معلوم ہوا کہ بت پرستی کے ایک سے دوسری نسل میں منتقل ہونے کا بڑا سبب آندھی تقلید یعنی اپنے باپ دادا کی غلط روش کو بلا قید وشرط قبول کرنا ہے گویا یہ عقل وتدبیر سے کام نہ لینا، تلاش وتحقیق کی زحمت نہ اُٹھانا اور پہلے لوگوں کی فضولیات کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔

"مترفون" مغرور دولت مندوں کی بطور خاص نشاہدی کرنے کی بقول مفسرین یہ وجہ ہے کہ دُنیا سے محبت، قسم قسم کی مادی لذات سے رغبت، عافیت کوشی وسہل پسندی اور تحقیق وجستجو کی زحمت نہ اُٹھانا یہ سب دولت مند لوگوں کی بُری صفات ہیں اور یہی اندھی تقلید اور بے سوچے سمجھے کسی کی پیروی کرنے کے اسباب ہیں جو خاص وعام سب کو گمراہی میں مبتلا کرتے ہیں۔

اگر وہ ثروت مند لوگ ان تاریکیوں سے باہر آجاتے تو حق وحقیقت تک پہنچنا اور ان کو پہچاننا کچھ بھی مشکل نہ تھا...... چنانچہ پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ہے: ہر گناہ وغلطی کا سرچشمہ دُنیا کی محبت ہے(حب الدنیا راس کل خطیئةٍ)[2]

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں ان کا یہ قول نقل ہوا"......ہم کو ان کے آثار کی پیروی کرنے کی ہدایت کی گئی ہے" جب کہ دوسری آیت میں ان کا یہ قول آیا ہے "ہم ان کے آثار کی پیروی کرتے ہیں"، ممکن ہے تعبیر کا یہ فرق علت ومعلول کے طور پر ہو۔ یعنی ان کا مدعا یہ ہو کہ ہم اپنے اسلاف کی پیروی اس لیے کرتے ہیں کہ ان کا طریقہ حق وہدایت سے تعلق رکھتا ہے۔

لیکن قرآن ان آیات کے مضامین کو آگے بڑھاتے ہوئے مضبوط دلائل کے ساتھ ان کے اس خیال باطل کی تردید کرتا ہے اور انبیاءؑ سابق کی زبانی نقل کرتا ہے کہ انہوں نے مشرکین کو اس کورانہ تقلید پر ٹوکتے ہوئے کہا تم نے اپنے بڑوں کو جس طریقہ پر کار بند پایا اگر ہم اس سے بہتر وبرتر آئین حیات لائے ہوں تو کیا پھر بھی اس کا انکار کرو گے؟" اس پر انہوں نے بڑے تعجب وغرور سے کہا تم جو آئین

---

[1] اُمةٍ کا لفظ مفسرین کے بقول اس آیت میں ایک آئین ودستور کے معنی میں ہے کہ جس پر ایک قوم کا اجماع ہو، لیکن بعض علماء اسے جماعت اور گروہ کے معنی میں لیتے ہیں، تاہم اس مقام پر بناء پر مشہور پہلے معنی ہی کو ترجیح حاصل ہے۔ اگرچہ قرآن کی دیگر آیات میں لفظ "امة" جماعت کے لیے آیا ہے اور اس کا ایک معنی گناہ بھی لیا جاتا ہے۔

[2] تفسیر کبیر فخر رازی جلد ۲۷ صفحہ ۲۰۶ تفسیر رُوح البیان اور تفسیر المیز ان میں بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

لے کر آئے ہو، ہم اس کا انکار کرتے ہیں''

البتہ جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، تقلید کی کئی ایک اقسام ہیں یعنی ایک تقلید اپنی جگہ پر مفید اور نفع بخش ہے کہ جس کے ذریعے علوم وفنون ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں، دوسری تقلید وہ ہے جو فضول اور احمقانہ ہے کہ اس سے بے بنیاد اور بے فائدہ رسوم اور طرح طرح کی بُری عادات واطوار غلط اعتقادات ونظریات آئندہ نسلوں میں سرایت کرتے ہیں.....ان تقلیدوں میں سے ہر ایک کی خاص علامات اور نشانیاں ہیں۔جن کی طرف ہم آیندہ صفحات میں اشارہ کریں گے۔

(۲) دوسری آیت میں بابل کے بُت پرستوں سے حضرت ابراہیمؑ کے مبارزہ کا ذکر ہے، آپ نے نہایت بلیغ انداز میں ان سے سوال کیا: یہ کیا چیزیں ہیں جن کی تم لوگ پرستش کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: انہوں نے کہا ہم ان بتوں کی پوجا کرتے اور انہی کے قدموں میں پڑے رہتے ہیں۔(قالوا نعبد اصناماً فنظل لها عا کفین)۔اس طرح انہوں نے نہ صرف بت پرستی کا اقرار کیا بلکہ اس پر فخر کا اظہار بھی کررہے تھے۔

حضرت ابراہیم نے ایک کڑا سوال کر کے ان کا ناطقہ ہی بند کر دیا.....انہوں نے کہا جب انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں یا تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں۔(قال هل یسمعونکم اذ تدعون ۔او ینفعونکم اویجرون) یعنی اگر یہ تمہیں کچھ نفع یا نقصان پہنچانے کے قابل نہیں ہیں تو کم از کم اپنے پجاریوں کی آواز ہی سنتے ہوتے، وگرنہ اس عبادت اور پوجا کا کیا فائدہ ہے۔ہاں وہ لوگ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتے تھے کہ یہ لکڑی اور پتھر کے بت ان کی دعا وپکار اور تضرع وزاری کو سنتے ہیں اور نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے کہ یہ ان کو کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں لہٰذا انہوں نے اپنے اسلاف کو رانہ تقلید کا سہارا لیا: انہوں نے جواب دیا..... بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے(قالو بل وجدنآ اٰبآءَ کذلك یفعلون) ایسا بے پایہ جواب دینا اگرچہ موجب ندامت ہے، لیکن ان کے لیے ان کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔

ان آیات کے سلسلہء بیان میں حضرت ابراہیمؑ ایک محکم اور جاندار دلیل سے ان مشرکین کو لاجواب کر دیتے ہیں.....فرماتے ہیں: یہ بت جن کو پرستش تمہارے اسلاف کرتے تھے اور تم بھی کررہے ہو۔یہ سب میرے دشمن ہیں اور میں ان دکا دشمن ہوں) اور میں تو صرف اس ذات کی عبادت کرتا ہوں جو سبھی اہل جہان کا پروردگار ہے۔میری پیدائش میری ہدایت میری خورد ونوش میرے بیماری وشفا۔میری زندگی موت اور بالآخر بخشش کرنے والا وہی ہے۔یعنی ایک ایسی ہستی لائق پرستش ہے جو ساری کائنات کا خالق اور تمام فوائد ومنافع کا مالک ہے۔نہ ایسے بے جان اور بے شعور مجسمے کو جو نہ اپنے اور نہ کسی اور کے کام آسکتے ہیں۔

(۳) تیسری آیت کہ جس میں قومِ فرعون کی زبانی بات کی گئی ہے۔اس میں یہی مضمون ایک دوسرے انداز میں بیان ہوا ہے۔فرمایا: (فرعون کے ساتھی موسیٰؑ سے) کہنے لگے کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اس (پنتھ) سے پھروے جس پر ہمارے باپ دادا رہے اور تم اس ملک میں حکومت وریاست حاصل کرو(قالوا اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیه ابائنا وتکون لکما الکبریآءُ

فی الارض[1])

چونکہ معاملہ اسی طرح ہے لہٰذا ہم تم دونوں پر ایمان نہیں لائیں گے (وما نحن لکما بمومنین)

درحقیقت ان کے پاس اپنے اس آئین زندگی اور اعتقاد وعمل کی حقانیت و پاکیزگی کی صرف یہی دلیل ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کا طریقہ اور ان کی رسم وراہ ہے، انہوں نے حضرت موسیٰ وہارونؑ پر الزام لگایا کہ تم دونوں شرک وبت پرستی کی مخالفت اور توحید کی دعوت کے ذریعے سے محض حکومت وریاست تک پہنچنا چاہتے ہو۔ ہم ایسا ہرگز نہیں ہونے دیں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گفتگو فرعون کے درباریوں نے کی ہے۔ اس میں انہوں نے موسیٰؑ وہارونؑ کی دعوتِ توحید کے مقابلے کے لیے دو شیطانی راہیں نکالی ہیں۔

(۱) جاہل عوام کے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے کہ تمہارے بزرگوں کا دین خطرے میں ہے۔

(۲) عوام میں موسیٰؑ وہارونؑ کی طرف سے بدظنی پیدا کی ہے۔ کہ ان کا مقصد حکومت پر قبضہ کرنا ہے وگرنہ شرک وتوحید کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

جابر حکومتیں اور طاغوتی حکمران عوام کو بے وقوف بنانے اور اپنے اقتدار غلبہ کو قائم رکھنے کے لیے یہی دو راستے اختیار کرتے ہیں، جیسے سورۃ طٰہٰ کی آیت ۶۳ میں اس کا بڑی صراحت سے ذکر کیا گیا ہے (قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾ [۲۰:۶۳]) انہوں نے کہا کہ یہ دونوں (موسیٰؑ وہارونؑ) ضرور جادوگر ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہارے وطن سے نکال باہر کریں اور تمہارے بہترین (اور قابل فخر) مذہب کو مٹا ڈالیں۔''

بت پرست ہمیشہ ایک ہی جواب دیتے رہے:

(۴) چوتھی آیت میں اسی بیان کو مشرکین مکہ کے ہمیشگی جواب کے طور پر ذکر کیا اور فرمایا: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کیے ہیں ان کی پیروی کرو تو (ہمیشہ) جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ (واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالو بل نتبع ما الفینا علیہ اٰبآئنا)۔

درحقیقت ہر مخالف اور دشمن کی گفتگو ایسی ہی ہوتی ہے کہ جب کوئی جواب بن نہ پڑے تو تقلید آباء کا سہارا لیتا ہے پھر تقلید بھی کورکورانہ اور بے سوچے سمجھے کی گئی اور جن کی تقلید کی ہے وہ گمراہ اور بے خبر لوگ ہیں لیکن وہ اس تقلید پر فخر بھی کرتے ہیں، جب کہ پیغمبروں کی طرف سے اپنی تبلیغ ودعوت کی حقانیت پر دیئے جانے والے دلائل کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔

قرآن کریم ایک مختصر سے جملہ میں مشرکین کی اس کمزور اور بودی دلیل کو رد کرتے ہوئے ایک سوال اٹھاتا ہے ''لیکن اگر ان کے باپ دادا نے عقل سے کام نہ لیا ہو اور راہ راست پر نہ رہے ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی (تقلید) کرتے رہیں گے؟ (اولو کان اٰباؤھم

---

[1] لتلفتنا۔ اس کا مادہ ''لفت'' بروزن ''حرف'' ہے کہ جس کے معنی کسی چیز سے ہٹانا یا اس کی طرف متوجہ کرنا ہے اگر یہ ''عن'' کے ساتھ متعدی ہو تو اس کے معنی پھر جانا ہیں اور اگر ''الیٰ'' کے ساتھ آئے تو اس کے معنی توجہ کرنا ہوں گے۔

لا یعقلون شیاءً ولا یهتدون[1]

یعنی اگر ان کی تقلید ''جاہل کے عالم کی تقلید کرنے'' کے مطابق ہوتی تو قابل قبول تھی لیکن وہاں یہ صورت نہیں تھی بلکہ ان کی تقلید ''جاہل کے جاہل کی تقلید کرنے'' کی شکل میں تھی کہ ایک گمراہ دوسرے گمراہ کی تقلید و پیروی کر رہا تھا۔ چنانچہ مشرکین مکہ کی تقلید آباء یہ تھی کہ بہت سے اندھے ایک اندھے کی لاٹھی پکڑے ہوئے تھے اور وہ انہیں تباہی کے گھڑھے کی طرف لیے جارہا تھا۔

اس آیت اور اس سے پہلے کی آیات کا انداز بتاتا ہے کہ یہاں مشرکین عرب کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے، بعض لوگوں نے جو یہ احتمال دیا ہے کہ ان آیات کو روئے سخن یہود کی طرف ہے اور انہوں نے اس ضمن میں ابن عباس سے اس کا شانِ نزول بھی نقل کیا ہے، لیکن یہ بعید نظر آتا ہے (غور کریں)۔

پانچویں اور آخری آیت بھی مشرکین عرب کے بارے میں ہے: جب ہماری واضح آیات (بذریعہ پیغمبر) ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ یہ (پیغمبر) بس ایک ایسا شخص ہے جو تمہیں ان کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے، جن کی پرستش تمہارے باپ دادا کرتے تھے (واذا تتلیٰ علیہم اٰیتنا بینات ٍ قالو ما ھذآ الا رجلٌ یرید ان یصد کم عما کان یعبدوآباؤ کم)

قرآن کہتا ہے یہ بُری عجیب بات ہے کہ مشرکین آیات بینات (واضح آیات، نشانیوں اور محکم دلائل) کے مقابلے میں تقلید آباء جیسی بے اصل حجت لاتے ہیں اور پیغمبر اکرم کی اس قدر تحقیر کرتے ہیں کہ انہیں ''رجل'' یعنی ایک شخص کہہ کر پکارتے ہیں اور عام لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی خاطر ہمارے بزرگ کہنے کی بجائے تمہارے بزرگ کہتے ہیں۔ اور ان کی تقلید کا واسطہ دیتے ہیں تاکہ پیغمبر اکرمؐ کے مقابل ان کے تعصب اور دشمنی کو ابھاریں۔

ان تمام آیات پر نظر کرنے سے معلوم ہوا کہ بت پرستی وسعت اور اس کے آئندہ نسلوں تک پہنچنے کا اہم اور بڑا ذریعہ تقلید ہی ہے۔ جب پیغمبر اکرمؐ نے بت پرستوں کی روک ٹوک کی تو سورۂ سباء کی آیت ۴۳ اور زخرف کی آیت ۲۲ کے مطابق ان لوگوں نے آپ کے جواب میں اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لیے تقلید آباء کو بطور دلیل پیش کیا۔ مزید یہ کہ زمانہ موسیٰؑ (سورۂ یونس'' آیت ۸۷) عہد ابراہیمؑ (سورۂ شعراء۔ آیت ۷۰ تا ۷۴) عصر ہود (سورۂ اعراف۔ آیت ۷۰) اور ایام صالحؑ (سورۂ ہود۔ آیت ۶۲) کے مطابق مشرک و بت پرست سب لوگ اسی تقلید آباء پر ہی تکیہ کرتے رہے ہیں۔

تقلید آباء کا یہ بہانہ صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ سورۂ زخرف کی آیت ۲۳ کے پیشِ نظر مشرکین اٹھ کھڑے ہوتے تھے، وہ لوگ ہر عہد میں پیغمبرانِ الٰہی کی دعوت سے انکار کرتے ہوئے اپنے آباء کی تقلید پر قائم رہنے اور ان کے طریقے پر چلنے کی آواز بلند کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ تقلید بت پرستی کے پیدا ہونے کا سبب نہیں بلکہ یہ اس کے دوام اور ایک سے دوسری نسل تک پہنچنے کا ایک بڑا عامل ہے۔

---

[1] یہ آیت ایک محذوف جملہ رکھتی ہے اور اصل میں اس کی صورت یہ ہے: ایتبعون الفو علیه ابآئھم فی کل حالٍ وفی کل شیءٍ ولو کان اٰبائوھم لا یعقلون شیئاً ولا یہتدون۔''

توضیحات

(۱) تقلید، اقوام کی ترقی یا انحطاط کا عامل:

اگر جاہل لوگ تقلید کے طور پر عالم و دانش مند افراد کی طرف رجوع کریں تو بلا شک اس سے معاشرے میں تکامل آتا ہے بلکہ اس سے علوم وفنون۔ اعلیٰ آداب ورسوم اور بہترین تربیتی مسائل ایک سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ بچے اپنی تمام معلومات معاشرے سے اسی طریقے سے حاصل کرتے ہیں اور اسی تقلید سے صنعت وحرفت میں ترقی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اگر تقلید میں معاشرہ ساز اور مثبت رُوح نہ ہو تو معاشرے میں تکاملی حرکت کا وجود ناپید ہو جاتا ہے۔

مثبت تقلید کی مثال خالص پانی جیسی ہے کہ جو انسانی زندگی کی اساس ہے لیکن اگر یہی پانی مختلف کثافتوں سے آلود ہو جائے تو کئی ایک بیماریوں کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک جاہل دوسرے جاہل کی تقلید کرے یا ایک عالم کسی جاہل کی تقلید کرے تو اس سے فساد بگاڑ بڑھ جاتا ہے۔ ناپسندیدہ عادات عام ہوتی ہیں۔ فکری بے راہ روی اور قسم قسم کے خرافات اور انحرافات ایک سے دوسری نسل اور ایک سے دوسری قوم تک پہنچتے رہیں گے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ تقلید کاہلی اور تعصب سے جنم لیتی ہے۔ جو لوگ تن آسانی کے باعث تحقیق وتلاش کی زحمت اٹھانا نہیں چاہتے وہ تقلید کی طرف رُخ کر لیتے ہیں۔ پھر ایسے متعصب اور ضدیت پسند افراد جو دوسری قوموں کی قوت وشوکت اور عروج وترقی کے علل واسباب کو جاننے اور انہیں اختیار کرنے کی کوشش نہیں کرتے وہ اپنی قوم کی منفی سوچوں اور کمزور نظریوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں پس یہی وہ تقلید ہے جو تعصب اور جہالت سے ملی ہوئی اور پستی کی طرف لے جانے والی ہے۔ نیز یہی وہ کورانہ تقلید ہے جو طول تاریخ میں شرک وبت پرستی کے فروغ کا ایک بڑا عامل رہی ہے [1]

(۲).....ہوائے نفس اور شیطانی وسوسے

آیات قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوا پرستی بھی شرک وبت پرستی کے عوامل میں سے ہے، جیسا کہ ہم قصہ سامری میں دیکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے اس سے پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا؟ اس نے جواب دیا: میں نے کچھ چیزیں دیکھیں جو یہ لوگ نہیں دیکھ سکے۔ میں نے فرستادہ خدا (جبریل) کے آثار پائے، پھر انہیں اپنے ذہن سے دور ہٹا دیا اور بت پرستی کی طرف لوٹ گیا۔ اس طرح میرے نفس نے اس چیز کو میری نظروں میں پسندیدہ بنا دیا (و كذالك سولت لی نفسی)

علاوہ ازیں آیاتِ قرآن سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فریب ہائے شیطانی اور اس کی طرف سے دلوں میں ڈالے جانے والے وسوسے

---

[1] بحث ہائے اقسامِ تقلید، شرائط تقلید ممدوح کورانہ تقلید کے اسباب اور لفظ ''تقلید'' کی شرح کے لیے اس تفسیر کی جلد اوّل میں ''حجاب تقلید'' کے باب کا مطالعہ کریں۔

بھی بت پرستی کا نمود یا اس کی بقاء ووسعت میں ایک عامل کی حیثیت رکھتے ہیں جیسا کہ قصہ بلقیس میں ایا تا ہے۔ وجدتها وقومها یسجدون للشمس من دون الله وزین لهم الشیطان اعمالهم فصدهم عن السبیل فهم لا یهتدون یعنی نے ملکہ سبا اور اس کی قوم کو اس حال میں پایا کہ وہ خدا کو چھوڑ کر سورج کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں ،شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نظروں میں پسندیدہ بنایا اور انہیں سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔ لہٰذا وہ راہ ہدایت کو نہیں جانتے۔(نمل۔ ۲۴)

لیکن یادر ہے کہ ہوائے نفس اور شیطانی وسوسے اصل میں وہم وخیال ،اندھی تقلید اور تعصب وضدیت سے نمود پاتے ہیں ، یہی وجہ ہے کہ ہم نے ہوائے نفس کا الگ سے ذکر نہیں کیا ہے۔

(۳)...... بت پرستی غلامی اور استعمار کا عامل ہے:

شرک و بت پرستی ہمیشہ جابروں اور آمروں کا ہتھیار رہا ہے۔ اور کے وجوہات یہ ہیں۔

(۱) عوام کی علمی وفکری سطح جتنی پست ہوگئی اسی قدر وہ جہلا طاغوتوں کے آلۂ کار بنے رہیں گے۔ اس لیے استعمال تحریکیں ہمیشہ جاہل ونادان لوگوں میں پروان چڑھتی ہیں ،استعماری سدا اس کو کوشش میں رہتے ہیں کہ بے چارے عوام پر علم کے دروازے بند رہیں تحقیق وجستجو کی کھڑکی نہ کھلنے پائے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اندھی تقلید کی ذلتوں میں پڑے رہ جائیں جیسا کہ قرآن فرعون کے بارے میں کہتا ہے (فاستخف قومه فاطاعوئه) اس نے اپنی قوم کو ذہنی طور پر پست کردیا اور وہ اس کی اطاعت میں لگے رہے۔ (زخرف ۵۴)

بت پرستی کی بنیاد جھوٹے وہم اور بے سرو پا خیالات ہیں لہٰذا یہ عوام کو بے وقوف بنانے کا ایک بڑا موثر ذریعہ ہے، اسی لیے بت پرستی جابر حکام کے ہاتھوں میں ایک کارآمد ہتھیار رہا ہے۔

(۲) شرک لوگوں میں اختلاف وانتشار کا سبب ہے جو ہر گروہ کو کسی نہ کسی چیز کی پرستش کرنے کی دعوت دیتا ہے......کچھ لوگ سورج کی پرستش کرتے ،بعض چاند کو پوجتے اور بعض ہبل، لات یا عزیٰ کی پوجا کیا کرتے ،حتیٰ کہ عرب میں ایک چھوٹی سی قوم قسم قسم کے بتوں کی پوجا کرنے کے باعث سینکڑوں گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی ،لیکن توحید ایک ایسا حلقۂ اتصال ہے جس نے ان کے دِلوں کو جوڑ کر ان کے خیالات میں یکسانیت پیدا کرکے انہیں اتحاد واتفاق کی نعمت سے ہم کنار کردیا۔

یہ یادر ہے کہ جب تک اختلاف وافتراق کا بازار گرم رہے گا اس وقت تک استعمار کو آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک ہے، کیونکہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، استعمار واستثمار (لوگوں کو غلام بنانے اور اُن کی کمائی کھانے) کے لیے ایک قدیم ترین اصول ہے۔ اس بناء پر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ فرعونوں ،نمرودوں اور ابوجہلوں نے ہمیشہ بت پرستی کی طرف داری میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

(۳) متکبر حکمران ہمیشہ اس بات کے خواہاں رہے ہیں کہ عوام ان کے آگے اس طرح جھکیں جیسے خدا کے سامنے جھکتے ہیں اور ان کے احکام کو مقدس فرمان کی طرح بے چون وچراں تسلیم کریں۔

ظاہر ہے کہ جولوگ لکڑی اور پتھر کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ وہ انسانوں میں سے زندہ خداؤں کو ماننے کے لیے بے عذر آمادہ ہوجاتے ہیں، اس لیے ہم دیکھ رہے ہیں کہ فرعون نے مصر میں اعلان کیا (انا ربکم الاعلیٰ) یعنی میں تمہارا سب سے بڑا خدا ہوں (نازعات۔ ۲۴) اس طرح فرعون نے خود کو تمام بتوں سے بڑا معبود قرار دیا۔

ان تین وجوہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ استعماری افکار ہمیشہ شرک و بت پرستی کی حمایت کرتے اور اسے فروغ دیتے رہے ہیں لیکن طریق انبیاء کہ جو جبر و استبداد اور ضعف و غلامی کی جڑیں کاٹتا رہا ہے وہ توحید و یکتا پرستی اور بیداری و آگاہی کا طریق راستہ ہے۔

اس مقام پر ہم ایک بار پھر حضرت امام جعفر صادقؑ سے مروی حدیث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس میں آپ نے فرمایا: ان بنی اُمیة اطلقو اللناس تعلیم الایمان ولم یطلقو العلیم الشرك لکی اذا حملوهم علیه لم یعرفوه[1]

یعنی بنی اُمیہ نے لوگوں کو اسلام و ایمان کی تعلیم حاصل کرنے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن انہیں شرک کے بارے میں معلومات کے حصول کا موقع نہ دیا تاکہ جب چاہیں ان پر شرک کے رسوم ٹھونس دیں اور وہ سمجھ ہی نہ پائیں۔

یہ امر قرآن کریم میں صراحتاً تو نہیں مگر اشارتاً موجود ہے۔ جیسا کہ سورۂ سباء کی آیت ۳۱ میں ہے: جب ظالمین (مشرکین) دربارِ خداوندی میں حاضر ہوں گے اور ایک دوسرے کے خلاف باتیں کریں گے تو جو لوگ دنیا میں کمزور اور دبے ہوئے تھے وہ ان جابروں سے کہیں گے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم مومن بن جاتے (ولو تریٰ اذ الظالمون موقوفون عند ربهم یرجع بعضهم الیٰ بعضٍ نِ القول یقول الذین استضعفو اللذین استکبرو الولا انتهم لکنا مومنین)۔

(۴)۔ عوامل شرک کے متعلق آخری بات:

ان تمام مباحث سے یہ بات واضح ہورہی ہے کہ دیگر اجتماعی امور کی طرح شرک و بت پرستی کا بھی کوئی ایک عامل نہیں ہے، بلکہ بہت سے عوامل کے نتیجے میں شرک کی نمود اور نشوونما ہوئی ہے..... ان میں انسان کی محسوسات سے رغبت اور محسوس خدا کی خواہش کے علاوہ علمی و فکری طور پر پسماندہ معاشروں میں فرضی قوتوں کے سہارے ڈھونڈنے کے باعث بت پرستی اور شرک کی بنیاد پڑتی ہے۔ مثلاً شفاعت، عزت اور تقرب الٰہی میں بتوں کے موثر ہونے کا فرضیہ یہ توہم کہ براہِ راست خدا کی عبادت نہیں کی جاسکتی، لہٰذا اس کے لیے کچھ وسائط ہونا ضروری ہیں اور انبیاءؑ و صلحاء کے نام پر بنائے ہوئے مجسموں کی طہارت و برکت کا نظریہ اور اسی طرح کے دیگر خیالات کے تحت شرک وجود میں آیا اور پروان چڑھا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اپنے آباء کی اندھی تقلید اور خداشناسی کے ضمن میں ضروری تحقیق و تلاش پر لوگوں کے آمادہ نہ ہونے، نیز جابر حکمرانوں کی طرف سے عوام کی شرک و بت پرستی سے رغبت کا غلط فائدہ اٹھانے اور اپنے شیطانی مقاصد کو پورا کرنے کی کوششیں بھی طول تاریخ میں شرک و بت پرستی کی پیدائش اور اس کے فروغ کا باعث بنتی رہی ہیں۔

---

[1] اصول کافی جلد ۲ صفحہ ۴۱۵ مطبوعہ بیروت۔

شرکِ وبت پرستی کی پیدائش اوراس کی بقاء کے ان قوی اسباب وذرایع کے مقابلے میں انبیاء کا توحیدی راستہ ہمیشہ کھلا رہا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے ایک طرف وہ انسانوں کومحسوسات کی چار دیواری سے نکل کر مادہ سے بلند تر دنیا کی تسخیر کے لیے علمی وفکری پرواز کرنے کی دعوت دیتے تھے۔ دوسری طرف سے انہیں خدا کی براہ راست عبادت کرنے، وہم وخیال کی باتوں سے آزاد ہونے، خدا کی بارگاہ میں اس کو سارے جہان کا پروردگار سمجھتے ہوئے سر جھکانے اور ہر حال میں اس کی پناہ حاصل کرنے کی تعلیم دے کر انسانیت کے بلند مقام پر پہنچاتے تھے۔ تیسری جہت سے انبیاء نے بنی نوعِ انسان کو جاہلانہ تقلید کی دیوار توڑنے، عالم ہستی کے بارے میں تحقیق وجستجو کرنے اور خدائے تعالیٰ کی آفاقی وانفسی آیات ونشانیوں کو جانتے پہچاننے کا شوق دلایا۔ انبیاء کے پیغام کی چوتھی جہت یہ ہے کہ انہوں نے انسانوں کو نااتفاقی اور تفرقہ بازی کے بتوں کو نابود کرنے، اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے، جابروں کی غلامی اور استحصالیوں کے پنجوں سے نکلنے کی ترغیب اور حوصلہ دیا۔

یہ ہیں کفر وایمان اور شرک وتوحید کے اصلی خدوخال!

اپنی اس گفتگو کو ہم تفسیر المیزان میں علامہ طباطبائی کے ان ارشادات کے ساتھ تمام کرتے ہیں۔ جو انہوں نے سورۂ ہود کی آیات ۳۶ تا ۳۹ کے ذیل میں...... بت پرستی کیسے شروع ہوئی...... کے عنوان سے رقم فرمائے ہیں!

گذشتہ مباحث سے معلوم ہوا کہ انسان ہمیشہ معنوی چیزوں کو مجسم کرنے اور غیر محسوس چیز کو محسوس ہونے والی چیز کے قالب میں ڈھالنے کے لیے مجسمہ سازی، تصویر کشی اور نقاشی کے جھنجھٹ میں پڑا رہا ہے۔ اس کے علاوہ فطری طور پر وہ ہر طاقت اور بلندی کے سامنے جھکتا اور اس کا احترام کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسان معاشروں میں بت پرستی ہمیشہ جاری وساری رہی ہے، یہ گمراہی نہ صرف ترقی یافتہ معاشروں میں موجود ہے بلکہ وہ انسانی گروہ جنہوں نے اپنی زندگی کی بنیاد انکار خدا پر رکھی ہے۔ وہ بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ جیسا کہ ان کے ہاں بڑی شخصیتوں کے مجسمے نظر آتے ہیں اور وہ ان کے سامنے اسی طرح جھکتے اور ان کا احترام کرتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر زمانہ قدیم کے انسانوں کی بُت پرستی یاد آنے لگتی ہے، قطع نظر اس سے آج بھی مشرق ومغرب میں کروڑوں انسان بُت پرستی کو اپنائے ہوئے ہیں۔

اس سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ بت پرستی کا آغاز اس طرح ہوا کہ وہ لوگ بطور یادگار اپنے بزرگوں اور نامور افراد کے مجسمے بناتے یا ان کی لاشوں کو محفوظ کرلیتے تھے اور پھر احتراماً ان کے آگے جھکتے اور کورنش بجالاتے تھے اسی بنا پر آج بھی بت کدوں اور عجائب گھروں میں بہت سے بت دیکھے جاسکتے ہیں جو مختلف قوموں کے دینی پیشواؤں کے نام پر بنائے گئے ہیں...... جیسے گوتم بدھ اور برہماجی کے مجسمے سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

ان لوگوں کا مردہ افراد کے مجسموں اور بتوں کے آگے حاضری بھرنا ان شواہد میں سے ہے جو یہ بتاتے ہیں کہ وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ افراد مرنے کے بعد ان سے دور نہیں ہوتے اور ان کی رُوحیں یہاں موجود رہتی ہیں نیز یہ کہ موت کے بعد ان کی توجہات اور افعال اور بھی کامل ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ وہ مادی جسم اور مادی اسباب کی پابندیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ پھر یہ اعتقاد یہاں تک راسخ ہوجاتا ہے کہ ہم دیکھتے ہیں فرعونِ مصر باوجودیکہ اس کے بت کی پوجا ہورہی تھی اور وہ دعوائے خدائی کرتا تھا تاہم قوت وبرکت کے حصول کی خاطر وہ بھی دوسرے بتوں

کی پوجا کرتا تھا[1]

ہاں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم اس بحث کے آخر میں اس عجیب اور حیرت انگیز نکتے کی طرف اشارہ کریں جس کا ذکر مشہور مغربی مورخ ویل ڈورانٹ نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔ نیز ہمارے زمانے میں دوسرے ملکوں کا سفر کرنے والے لوگوں نے اپنے مشاہدات کے ضمن میں اس کی تائید کی ہے کہ وہاں بعض بت ایسے بھی ہیں جو مرد وزن کی شرمگاہوں کی صورت میں ہیں اور اکثر لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔

ویل ڈورانٹ لکھتا ہے۔

وہ پہلی چیز جس کی پرستش کی گئی شاید وہ ''چاند'' تھا کہ جو بلند مقام پر موجود رہتا ہے۔ اور چاند عورتوں کا محبوب ترین معبود تھا اور وہ اسے اپنا خاص خدا سمجھ کر اس کی پوجا کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ چاند فضائے عالم پر حکومت کرتا ہے۔ اور برف و بارش اسی سے حاصل ہوتی ہے، حتیٰ کہ قدیم روایتوں کے مطابق مینڈک بھی بارش کے لیے چاند ہی کے آگے تضرع وزاری کرتے ہیں۔

وہ اس سلسلے میں مفصل بیان کے بعد اور سورج، زمین، پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کیے جانے کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید کہتا ہے۔

چونکہ قدیم ادوار کے لوگ اس بات سے بے خبر تھے کہ انسانی نطفے کا انعقاد ''اسپرز'' اور ''اوول'' کی باہمی آمیزش سے ہوتا ہے۔ اس لیے وہ یہ تصور کرتے تھے کہ انسان کی یہ عجیب پیدائش مرد وزن کی جنسی آلتوں سے ہو رہی ہے، وہ یہ بھی باور کرتے تھے یہ ان آلتوں میں ایک رُوح پوشیدہ ہے جو ایک انسان کی عجیب وغریب پیدائش کا سرچشمہ ہے پس ان کا یہی مفروضہ آہستہ آہستہ اس کی بنیاد بن گیا کہ وہ ان ہر دو انسانی آلتوں کی الوہیت کے قائل ہوئے اور ان کی شکلوں کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش کرنے لگے۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ویل ڈورانٹ یہ بھی لکھتا ہے کہ قدیم اقوام میں کوئی ایسی قوم نہیں ہوئی جو ان دونوں انسانی آلتوں کو پوجتی نہ رہی ہو۔[2]

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے اشارہ کیا ہے کہ اب بھی جاپان اور بھارت میں بڑے فخر وناز کے ساتھ مرد وزن کی آلتوں کی شکل کے بتوں کو پوجا کی جاتی ہے۔

اس بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اگر انسان انبیاء کی تعلیمات سے انحراف کرے تو کیسے کیسے بدبودار گڑھوں میں جا پڑتا ہے اور کیسے کیسے مضحکہ خیز اور شرمناک افعال انجام دینے لگتا ہے۔

اس دنیا میں رہنے والے پاکیزہ دین کے پیروکار توحید پرست مسلمین ومومنین اس پر جتنا بھی شکر ادا کریں وہ کم ہے کہ انبیاء کی تعلیمات نے انہیں شرک وبت پرستی کی آلودگی اور ایسے ہی دیگر بدترین طریقوں اور راستوں کی طرف جانے سے بچائے رکھا ہے۔

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۰ صفحہ ۲۷۴ (ملخصاً)

[2] ویل ڈورانٹ۔ تاریخ جلد ا صفحہ ۹۵ (ملخصاً)

اقسام توحید

(۱) توحید ذات (۲) توحید صفات (۳) توحید عبادت (۴) توحید افعال

توحید کی بنیادی اقسام:

گذشتہ مباحث میں یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کے مطابق تمام انبیاء اور کتبِ آسمانی کی دعوت و پیغام کی جڑ بنیاد مسئلہ توحید ہی ہے جس کے لیے قرآن نے عقلی و منطقی دلائل دیئے ہیں۔ اب ہم اس مقام پر آ پہنچے ہیں کہ توحید کے مختلف گوشوں اور اس کے گوناگوں اقسام کی طرف متوجہ ہوں، ہماری اس بحث سے ''مسئلہ توحید'' کی اہمیت اور بھی واضح ہو گئی۔

علماء علم کلام کے درمیان یہ چیز معروف ہے کہ توحید کے اصلی اور بنیادی شعبے اور قسمیں چار ہیں۔

(۱) توحید ذات: خدا کی ذات یکتا اور بے مثل و بے نظیر ہے۔

(۲) توحید صفات: تمام صفات کی بازگشت ایک ہی حقیقت کی طرف ہے اور یہ اس کی عین ذات ہیں۔

(۳) توحید عبادت: عبادت و پرستش بس اسی ذات ہی کے لیے ہے۔

(۴) توحید افعال: خلقت و آفرینش اور کائنات کا انتظام و تدبر یعنی ہر فعل اور ہر حرکت جو اس وسیع عالم میں ہے وہ اسی ذات واحد کی طرف سے ہے۔ (لاموثر فی الوجوء الا اللہ) البتہ جیسا کہ اس کی شرح آگے آئے گی یہ چیز انسان کے بااختیار و مختار ہونے سے کوئی منافات نہیں رکھتی۔

خود ''توحید افعال'' کی بھی کئی اقسام ہیں جن میں سے اہم ترین قسمیں یہ ہیں:

(۱) توحید خالقیت: خلقت و آفرینش صرف اسی کی طرف سے ہے۔

(۲) توحید ربوبیت: تدبر عالم تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔

(۳) توحید مالکیت: وہی تکوینی مالک و حاکم ہے۔

(۴) توحید حاکمیت: تشریع و قانون سازی اسی کا کام ہے۔

(۵) توحید اطاعت: صرف اسی کے فرمان یا اس کے مامورین کی اطاعت و فرمانبرداری ہو گی۔

یاد رہے کہ خدا کے افعال صرف یہ پانچ ہی نہیں ہیں۔ اس لیے توحید افعالی بھی ان میں منحصر نہیں ہے۔ لیکن اس کی پانچ اقسام ایسی ہیں کہ اصلی و بنیادی تقسیم انہی میں آ جاتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ ایک اور نقطہ نظر سے ہم توحید کو دو قسموں یعنی توحید خاص اور توحید عام میں بھی تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) توحید خاص: اس میں توحید کی وہی قسمیں شامل ہیں جن کو اس طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے:

(۲) توحید عام: اس کے مختلف پہلو ہیں جن کو اس طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے:

(الف) توحید در نبوت: سارے انبیاء ایک ہی ہدف و مقصد کے لیے سرگرمِ عمل رہے اور ان کا لائحہ عمل ایک ہی تھا، لہٰذا اساس دعوت اور ان کی ماموریت کے لحاظ سے ہم ان کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتے (لانفرق بین احد من رسلہ)

(ب) توحید در معاد: سب انسان قیامت کے روز ایک ہی عدالت میں حاضر ہوں گے۔

(ج) توحید در امامت: سب آئمہ ایک ہی بات کہتے رہے ایک ہی حقیقت کی پیروی کرتے رہے اور وہ سب ایک ہی نور تھے۔

(د) توحید در نظم و عدالت: تمام انسانوں کے لیے خدائی قانون ایک جیسا ہی ہے۔

(ر) توحید در جامعہ انسانی: خدا کے سب بندے ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں، ان میں رنگ، نسل اور زبان کے اختلاف سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور سبھی مل کر ایک ہی معاشرہ تشکیل دیتے ہیں۔

اس مختصر مقدمے کے بعد ہم آیاتِ قرآن کی طرف توجہ کرتے اور توحید کی اقسام میں سے ہر ایک کا جداگانہ تذکرہ کرتے ہیں۔

توحید ذات وصفات

اشارہ:

جب توحید ذات کا ذکر ہوتو اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی کوئی شبیہ، نظیر اور مثال نہیں اور وہ ہر لحاظ سے واحد و یکتا اور یگانہ ولاشریک ہے۔

چونکہ گزشتہ مباحث میں معمولا ذات کا ذکر ہوا اور جن آیات قرآن پر نظر کی گئی وہ بھی توحید ذات ہی سے متعلق تھیں، اس لیے اب ہم اس سے صرف نظر کر رہے ہیں اور یہاں از روئے قرآن خود مسئلہ توحید کی تحقیق کریں گے۔

سب سے پہلے ان آیات پر توجہ کریں:

(۱) لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ⑪ [۴۲:۱۱] (شوری)

(۲) لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ⑬ (مائدہ)

(۳) قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝ [۱۱۲:۴] (سورہ اخلاص)

ترجمہ:

(۱) کوئی اس کی مثل نہیں اور وہ سننے دیکھنے والا ہے۔

(۲) جن لوگوں نے کہا کہ خدا تین میں سے ایک ہے۔ وہ کافر ہو گئے، خدائے یکتا کے سوا کوئی معبود نہیں، اگر انہوں نے اپنی اس بات کو ترک نہ کیا تو ان کافروں کو دردناک عذاب پہنچے گا۔

(۳) کہو..... خدا یکتا و یگانہ ہے، خدا بے نیاز ہے نہ اس کی کوئی اولاد ہے، نہ وہ کسی کی اولاد ہے، اس کی کوئی شبیہ و مثال نہیں۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

اے وہ ذاتِ جو وہم وخیال سے بلند تر ہے:

(۱) پہلی آیت مختصر الفاظ میں توحید ذاتی کا ذکر کررہی ہے ،اس میں توحید کی گویا مکمل اور بولتی ہوئی تفسیر ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔(لیس کمثلہٖ شیءٍ)

یہ درست ہے کہ توحید ذات ایک ایسی چیز ہے جو خیال وقیاس اور وہم وگمان سے بلند ہے اور اس ذات کی اصلیت کو سمجھنا ہمارے لیے غیر ممکن ہے کیونکہ ہم ایسی چیزوں کا تصور کر سکتے ہیں جن کی مثل ہم نے دیکھ رکھی ہو یا دیکھی ہوئی چیزوں کا تجزیہ کرنے سے ان دیکھی چیزوں کو جانتے سمجھتے ہیں، لیکن وہ چیز کہ جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو وہ ہمارے وہم وعقل میں نہیں آتی۔ ہم اس ذات کے بارے میں بس اتنا ہی جانتے سمجھتے ہیں، لیکن وہ چیز کہ جس کی کوئی مثال موجود نہ ہو وہ ہمارے وہم وعقل میں نہیں آتی۔ ہم اس ذات کے بارے مُں بس اتنا ہی جانتے ہیں کہ وہ ''موجود'' ہے اور اس دُنیا کی وسعتوں میں اس کے افعال اور آثار کو دیکھ کر اس کے اوصاف سے اجمالی واقفیت حاصل کرتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی انسان حتیٰ کہ انبیاء ومرسلین اور ملائکہ مقربین بھی اس ذاتِ مقدس کی واقعیت سے شناسا نہیں ہیں۔

چنانچہ اسی بات کا اعتراف ہی اس کے بارے میں انسان کی معرفت کا آخری درجہ ہے، جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں ہے۔ (ماعرفناك حق معرفتك) ''ہم نے تجھے نہیں پہچانا جیسے تجھ کو پہچاننے کا حق ہے۔'' پس پیغمبر اکرمؐ کا یہ فرمان خدا کی نسبت انسان کے عرفان کا آخری نقطہ ہے۔

اس کی واضح دلیل موجود ہے جیسا کہ بحث توحید میں بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے لامتناہی اور غیر محدود ہے لہٰذا خدا کو اس کے غیر کے ذریعے سے نہیں پہچانا جا سکتا۔ جب ہماری عقل وفکر محدود ہے تو وہ ایک غیر محدود حقیقت کو کیسے پا سکتی ہے؟

اس تفسیر کے پیشِ نظر کلمہ کاف جملہ (لیس کمثلہٖ شیءٍ) میں زاہد ہے [1] یعنی کوئی ایسی چیز وجود نہیں رکھتی جو اس ذات کبریاء کی مانند ہو...... ہاں یہ ممکن ہے کہ اس کے وجود، علم اور قدرت کی کوئی نشانی اس عالم ممکنات میں ظاہر ہو جائے لیکن کائنات میں کوئی بھی مخلوق اس کی مثل نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔

لیکن بعض علماء جو کاف کو زائدہ نہیں سمجھتے انہوں نے کہا ہے: آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مثل خدا جیسی کوئی چیز نہیں اور اس صورت میں مثل کا معنی ذات ہوگا، جیسے ہم کہتے ''تیرے مثل اس غلط راہ پر قدم نہیں بڑھائے گا (یعنی تجھ یہ کام نہیں کرنا چاہیے) بعض کا کہنا ہے کہ یہ ''مثل'' صفات کے معنوں میں ہے کوئی وجود خدا جیسے اوصاف نہیں رکھا، ظاہر ہے کہ ہمارے بحث میں ان تینوں تفسیروں کا نتیجہ ایک ہی ہے

---

[1] تفسیر روح المعانی آیا ہے کہ بعض مفسرین اس آیت میں لفظ ''مثل'' کو زاہدہ تصور کرتے ہیں لیکن ابوحیان نے اس کی تدرید کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''لغتِ عرب میں اسم کبھی زائدہ نہیں لایا جاتا۔

اگر چہ وہ مختلف طریقوں سے اس مطلب تک پہنچتی ہیں۔

یہاں اس حدیث کی طرف توجہ کرنا چاہیے جس میں ہم یوں پڑھتے ہیں: ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے یہ سوال کیا۔ (ما راس العلم) یعنی علم کا اعلیٰ ترین مرحلہ کونسا ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا (معرفة الله حق معرفته) خدا کی شناخت کرنا جیسا کہ شناخت کا حق ہے۔ پھر فرمایا ان تعرفهٗ بلا مثالٍ لا شبة وتعرفجه الها واحدًا خالقاً قادرًا اوّلا واٰخراً وظاهراً وباطناً، لا كفوله ولا مثل له فذاك معرفةُ اله حق معرفته[1] یعنی جان لو کہ اس کی نہ مثال ہے نہ شبیہ..... وہ معبود، یکتا، خالق، قادر، اوّل، آخر، ظاہر اور باطن ہے، اس کی نہ کوئی مثال ہے نہ نظیر پس یہ ہے کہ معرفتِ خدا جیسے معرفت کا حق ہے۔

واضح ہے کہ ''حق معرفت'' نسبتی حیثیت رکھتا ہے۔ ویسے اس کی معرفت تک تو کوئی پہنچ ہی نہیں سکتا۔

نہ بر واج ذاتش پرد مرغ وحی
نہ بر ذیل وصفش رسد دست فہم
چوخا صا دریں راہ فرس رندہ اند
بہ ''لا احصٰی'' از تک فرد ماندہ اند

(۲) جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا تین اقانیم میں سے ایک اقنوم ہے[2]

دوسری آیت میں قرآن ان کو کافر قرار دے رہا ہے (لقدْ كفر الذين قالو ان الله ثالثِ ثلاثةٍ) اس طرف توجہ کرنا چاہیے کہ یہ آیت نہیں کہتی کہ جو تین خداؤں کا اعتقاد رکھتے ہیں وہ کافر ہیں بلکہ وہ کہہ رہی ہے کہ جو لوگ خدا کو تیسری اصل یا تیسری ذات تصور کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔

مفسرین نے اس کا مطلب سمجھنے کیلئے کئی راہیں اختیار کی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو خدا کو ''اب'' ''ابن'' روح القدس تین میں سے ایک جوہر سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس تعدد کے باوجود وہ واحد و یکتا ہے جیسے لفظ ''خورشید'' کہ اس میں سورج کا وجود، روشنی اور حرارت تینوں ہی شامل ہیں اور وہ وجودی طور پر ایک ہی ہے[3]

ایک اور تعبیر کے مطابق اس آیت میں اسی عقیدہ توحید در تثلیث'' کا ذکر ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر چہ خدا تین ہیں لیکن وہ ایک ہی ہیں (تاہم یہ بات غیر معقول ہے کیونکہ تین کا عدد کبھی ایک کے برابر نہیں ہوتا مگر یہ کہ ان دونوں اعداد میں سے ایک حقیقی اور دوسرا مجازی ہو)

تفسیر قرطبی میں کہا گیا ہے۔ کہ یہ آیت نصاریٰ کے خاص فرقوں کی طرف اشارہ کرتی ہے یعنی ملکیہ یا ملکانیہ یعقوبیہ اور نسطوریہ کہ جو

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۱۴۔

[2] ''اقنوم'' کے معنی اصل اور ذات کے ہیں اور اس کی جمع اقانیم ہے، یہ وہ تعبیر ہے جو مسیحی حضرات تین خداؤں اور مسئلہ تثلیث کے لیے پیش کرتے ہیں۔

[3] تفسیر فخر رازی جلد ۱۲ صفحہ ۶۰۔

معتقد ہیں کہ ''اب'' ''ابن'' روح القدس'' (باپ خدا۔ بیٹا خدا۔ روح القدس) تینوں ایک ہی ذات ہیں [1]

لیکن ظاہراً یہ اشتباہ ہے، کیونکہ یہ عقیدہ تو تمام مسیحیوں کا ہے کہ وہ ''تثلیث میں توحید'' کے قائل ہیں علامہ طباطبائی فرماتے ہیں: اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ تینوں میں سے ہر ایک خدا ہے خدا کا فقط ان میں سے ہر ایک پر منطبق ہے اور (باپ۔ بیٹا، روح القدس) تین ہیں لیکن دراصل ایک ہی ہیں [2]

مگر ظاہر آیت سے مراد کچھ اور ہے، اصل بات یہ ہے کہ خدا کو تیسرا اقرار دینا کفر ہے بلکہ خدا کو مادی موجودات کے مانند اور ہم پلہ تصور کرنا اور تیسری ذات شمار کرنا یا بہ الفاظ دیگر اس میں وحدت عددی کا قائل ہونا کفر ہے (غور کریں)

اس مفہوم و مطلب کی عمدہ تشریح امیر المومنینؑ کے ایک فرمان میں موجود ہے۔

جنگِ جمل کے دوران ایک اعرابی حضرت امیر المومنینؑ کی خدمت میں آیا اور کہا: یا حضرت! کیا آپ کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے؟ اچانک لوگوں نے اس پر ہجوم کیا اور کہنے لگے: اے اعرابی! کیا تو نہیں دیکھتا کہ امیر المومنینؑ بہت سے اہم مسائل کی طرف متوجہ ہیں اور پھر ہر بات کا ایک موقع ہوتا ہے۔

لیکن امیر المومنینؑ نے فرمایا: (دعوہ فان الذی یریدہ الاعرابی ھو الذی نریدہ من القوم) اس کو چھوڑ دو کہ کچھ یہ اعرابی ہم سے پوچھ رہا ہے وہی چیز ہم اپنے دشمن گروہ میں دیکھنا چاہتے ہیں (وہ توحید ہی ہے کہ جس کی خاطر ہم ان سے جنگ کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا: اے اعرابی! یہ جو ہم کہتے ہیں کہ خدا ایک ہے تو اس کے چار معنی ہیں، ان میں سے دو معنی ایسے ہیں جو خدا کے بارے میں درست اور روا نہیں اور دو معنی وہ ہیں جو اس ذات کے لیے ثابت اور مسلم ہیں۔

وہ دو معنی جو اس کے لیے روا نہیں، یہ ہیں کہ کوئی کہے ''خدا واحد ہے'' اور اس کا مقصد واحد عددی ہو یا یہ درست نہیں..... اس لیے کہ جو چیز جیسی دوسری نہیں رکھتی وہ اعداد میں داخل نہیں ہوتی اور اس کے بارے میں ایک۔ دو کے اعداد غیر ضروری ہیں) پھر کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو یہ کہتا ہے کہ انہ ثالث ثلاثۃٍ یعنی خدا تین میں تیسرا ہے، قرآن اسے کافر گردانتا ہے۔ اسی طرح جو یہ کہے کہ وہ احد ہے اور اس کے خیال میں واحد نوعی کی بات ہو تو یہ بھی درست نہیں کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی مثال اور شبیہ متصور ہو سکتی ہے۔ جب کہ وہ کسی نوع میں شمار ہونے سے بلند و برتر ہے۔

ہاں توحید کے دو معنی جو خدا کی شان کے لائق ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ کوئی کہے ''وہ واحد ہے'' یعنی اس کی کوئی مثال و شبیہ نہیں ہے اور ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے دوسرا معنی جو توحید الٰہی کے لیے مناسب ہے وہ یہ ہے کہ کوئی کہے خداوند متعال احدی المعنی یعنی اس کی ذات میں وہم، عقل اور خارج میں ہرگز تقسیم نہیں ہو سکتی یقیناً ہمارا پروردگار ایسا ہی ہے [3]

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۴ صفحہ ۲۲۴۶ اور یہی بات دیگر تفسیروں جیسے رُوح البیان و المنار میں بھی اس آیت کے ذیل میں آئی ہے۔

[2] تفسیر المیزان جلد ۶ صفحہ ۷۳۔

[3] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۰۶ حدیث ۱

(۳) آیات کے تیسرے اور آخری مجموعے میں جو سورۂ اخلاص میں شامل ہیں.....خدائے تعالیٰ کی یگانگی و یکتائی کو بطریق احسن بیان کیا گیا ہے۔ ان آیتوں میں وہ جامعیت پائی جاتی ہے کہ یہ بیک وقت نصاریٰ کی تثلیث کو نابود کرتی ہیں مجوس (آتش پرست پارسیوں) کے عقیدۂ ثنویت (دوگانہ پرستی) کی نفی کرتی ہیں اور مشرکین کے متعدد معبودوں (دیوتاؤں) کے مقابل خدا کی وحدانیت کو ثابت کرتی ہیں سب سے پہلے فرمایا کہو.....خدا یکتا و یگانہ ہے (قل هو الله احد)

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ سے توحید کے متعلق مختلف سوالات کیے جاتے تھے، آپ کو حکم دیا گیا کہ ان سب کا جواب ایک مختصر سی آیت میں دے دیں، جس کے الفاظ کم اور معانی بہت زیادہ ہیں یعنی یہ قلیل کلمات بہت سے مضامین اور کثیر دلائل پر مشتمل ہیں۔

''احد'' اصل میں ''وحد'' تھا جس کا مادہ ''وحدت'' ہے اس کا واؤ ہمزہ میں تبدیل ہو گیا اور یوں، ''وحد'' سے ''احد'' بن گیا ہے اس لیے بعض علماء کے نزدیک ''واحد'' اور ''احد'' کا معنی ایک ہی ہے بعض روایات میں بھی اس طرف اشارہ ہوا ہے کہ ان دونوں لفظوں کا معنی ایک ایسی ذات ہے، جس کی کوئی مثال نہیں[1]

لیکن بعض لوگوں نے ''واحد'' اور ''احد'' میں فرق کیا اور کہا ہے کہ ''احد'' خدا کی خاص صفات میں سے ہے اور یہ انسان یا کسی اور شے پر نہیں بولا جاتا، بعض کا کہنا ہے کہ ''واحد'' نفی و اثبات دونوں میں استعمال ہوتا ہے جب کہ ''احد'' صرف نفی کے لیے لایا جاتا ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ ''احد'' میں وحدتِ ذات اور ''واحد'' میں وحدت صفات کی طرف اشارہ ہے، ''احد'' اس ذات پر بولا جائے گا، جو کثرت کو قبول نہ کرتی ہو، یعنی خارج اور ذہن میں اس کے لیے کثرت کا شائبہ نہیں لہٰذا اسے شمار نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن ''واحد'' کے بعد دو اور تین کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''احد'' اس ذات کے بسیط ہونے اور ہر قسم کے اجزاء سے پاک و منزہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ ''واحد'' اس کی یکتائی اور بے مثل و بے مانند ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

لیکن ان چاروں تفسیروں میں سے کسی کے لیے بھی کوئی واضح دلیل نہیں ہے، مثلاً اتوار کو یوم الاحد کہتے ہیں اور قرآن میں خدا کو ''الٰہ واحد'' کہا گیا ہے (بقرہ۔ ۱۶۳) اسی طرح ''احد'' اثبات کی صورت میں بھی آیا ہے جیسے آیت زیرِ بحث اور دیگر آیاتِ قرآن میں[2] ہے

بہرحال قول صحیح یہی ہے کہ ''احد'' ''احد'' دونوں ایک ہی معنی رکھتے ہیں، بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ ''اللہ احد'' خدائے تعالیٰ کی معرفت کے لیے کامل ترین جملہ ہے جو عقل انسانی میں آ سکتی ہے۔ کیونکہ ''الٰہ'' میں ایسی ذات کی طرف اشارہ ہے جو تمام صفات کمال یعنی تمام صفات ثبوتیہ کو چاہے۔ اور ''احد'' اس ذات سے تمام صفات سلبیہ کی نفی پر دلالت کرتا[3] ہے۔

قرآن مجید ان آیات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے: خدا قائم بالذات، بے نیاز ہے، ہر حاجت مند اسی کی طرف توجہ کرتا اور اسکی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے (الله الصمد)

---

[1] بحار الانوار جلد ۳ صفحہ ۲۲۲۔

[2] مثلاً سورۂ توبہ آیت، سورۂ نساء آیت ۴۳، سورۂ مریمؑ آیت ۲۶، سورۂ بقرہ آیت ۱۸۰ سورۂ کہف آیت ۱۹ وغیرہ ہم۔

[3] تفسیر فخر ارازی جلد ۳۲ صفحہ ۱۸۰

''صمد'' مقاییس اللغۃ کے مطابق اس میں بنیادی طور پر دو چیزیں شامل ہیں...... پر ہونا، قصد و ارادہ رکھنا اور استحکام وصلابت...... جب یہ لفظ خدا کے لیے بولا جائے تو مطلق استغناء اور کامل بے نیازی مقصود ہوتی ہے، کیونکہ تمام حاجت منداس کی طرف رجوع کرتے ہیں، نیز اس سے خدا کا واجب الوجود اور قائم بالذات ہونا مراد ہوتا ہے۔

ممکن ہے ان دونوں باتوں کی بنیاد ایک ہی ہو اور اس سے بھی ایسی ذات مراد ہو جس میں استحکام وصلابت اور قیام بالذات پایا جاتا ہے۔ اس طرح وہ ذات کامل طور پر بے نیاز ہوگی کہ سبھی نیاز منداس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے لفظ ''صمد'' کے ذریعے تمام صفات ثبوتیہ وسلبیہ کی طرف اشارہ پایا جائے گا یہی وجہ ہے کہ روایات میں ''صمد'' کے بہت سے معنی ذکر کیے گئے ہیں جو خدا کی کسی نہ کسی صفت کی طرف اشارہ کرتے ہیں[1]

بہرحال اس ایت کا پہلی آیت سے رابطہ وتعلق پوشیدہ نہیں کہ جس میں خدا کی وحدانیت کا تذکرہ ہوا ہے، اس لیے کہ ''واجب الوجود'' بے نیاز ہوگا اور تمام محتاجوں کا اس کی طرف رجوع کرنا ضروری اور ایسی ذات کی یکتائی و یکانگت اس کا لازمہ ہے۔

اس سے اگلی آیت بھی حقیقت توحید پر زور دیتی ہے کیونکہ یہ نصاریٰ کے تین خداؤں (باپ، بیٹا، روح القدس) کے عقیدے کی تردید کرتی ہے، یہودیوں کی طرف سے عزیز کے خدا کا بیٹا ہونے کو باطل قرار دیتی اور مشرکین عرب کے اس نظریئے کی تغلیط کرتی ہے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں چنانچہ ان بے اصل اعتقادات اور ایسے ہی دیگر مفروضات کی نفی کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ نہ تو اس کی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے (لم یلد ولم یولد)

یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جو وجود فرزند یا باپ رکھتا ہو یقیناً اس کی مثال اور شبیہ بھی ہوتی ہے، کیونکہ باپ اور بیٹے کی مماثلت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے لہٰذا ایسا وجود یکتا و بے نظیر نہیں ہوسکتا یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد اس بیان کو مکمل کرنے کے لیے فرماتا ہے۔ اس کی کوئی شبیہ ومثال نہیں ہے (وَلم یکن لہ کفواً احدٌ)

اس ترتیب کے ساتھ اس سورۂ کی آیات خداوندکریم کی یکتائی و یگانگی اس ذات کی واحدانیت اور اس کی مثل ونظیر کے نہ ہونے کی تاکید پر تاکید کرتی چلی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر اس سورۂ کی ہر آیت اپنے سے پہلی آیت کی تفسیر کرتی ہے اور مجموعی طور پر توحید ذات کو جامع اور کامل طریقے سے واضح کرتے ہوئے توحید کے شجر ثمر دار کو اس کے تمام تر شاخ و برگ کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲۷ میں سورۂ اخلاص کی تفسیر میں لفظ ''صمد'' پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے۔

توضیحات

(۱) توحیدذات کا گہرا مفہوم:

بہت سے لوگ توحید کے معنی اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے اور دو نہیں ہیں۔ جیسا کہ امیر المومنینؑ کی فرمودہ حدیث میں آیا ہے جو انہیں آیات کی تفسیر میں مذکور ہوئی۔ توحید کے لیے یہ تعبیر درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا مفہوم واحد عددی ہے (یعنی خدا کے ساتھ کسی دوسرے کا تصور ممکن نہیں لیکن وہ وجود خارجی نہیں رکھتا) یقیناً یہ قول درست نہیں اور صحیح یہ ہوگا کہ کہا جائے .....خدا ایک ہے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کا تصور نہیں آتا۔ بہ الفاظ دیگر خدا کی کوئی مثل، نظیر اور شبیہ نہیں ہے کہ نہ کوئی چیز اس جیسی ہے اور نہ وہ کسی چیز جیسا ہے اس لیے کہ ایک بے نہایت ولامحدود وجود اسی صفت کا مالک ہوتا ہے۔

اسی دلیل کے مطابق ہم ایک حدیث میں بھی دیکھتے ہیں کہ امام جعفر صادق نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا (ای شئی اللہ اکبر) اللہ اکبر کا کیا مطلب ہے؟ اس نے عرض کیا (اللہ اکبر من کل شیءٍ) خدا ہر چیز سے بڑا ہے۔ امامؑ نے فرمایا (فکان ثم شیءٍ فیکون اکبر منہ) آیا کوئی چیز اس کی مانند ہے کہ خدا اس سے بڑا ہے؟ صحابی نے عرض کیا: (فما ھو) پھر اللہ اکبر کا مطلب کیا ہے؟ فرمایا (اللہ اکبر من ان یوسف) خدا اس سے بلند ہے کہ اس کا وصف بیان ہو سکے [1]

(۲) توحیدصفات کا مفہوم:

جب ہم کہتے کہیں توحید کی ایک شاخ ''توحیدصفات'' بھی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ جس طرح اپنی ذات میں ازلی وابدی ہے اسی طرح اس کی صفات .....علم، قدرت، ارادہ وغیرہ بھی ازلی وابدی ہیں۔ دیگر یہ کہ اس کی یہ صفات زائد بر ذات نہیں بلکہ عین ذات ہیں اور پھر یہ صفات ایک دوسری سے جدا نہیں یعنی علم وقدرت وغیرہ باہم ایک ہی ہیں اور عین ذات بھی ہیں۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ جب ہم اپنی طرف نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ابتداء ہم صفات سے عاری تھے اور پیدائش کے وقت علم وقدرت وغیرہ نہیں رکھتے تھے۔ بعد میں ہم آہستہ آہستہ پلے بڑھے تو یہ صفات پیدا ہوئیں، لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ ہماری یہ صفات ہماری ذات پر زائد ہیں اور ممکن ہے کہ ایسا وقت بھی آ جائے کہ ہم تو ہوں مگر یہ زور بازو اور علم ودانش ہم میں موجود نہ ہوں۔ نیز یہ بھی واضح ہے کہ یہ علم وقدرت ہمارے اندر جدا جدا ہیں۔ یعنی قوت بازوؤں میں ہے اور علم ہماری رُوح میں جاگزیں ہے۔

لیکن خدا کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا ہے، اس کی تمام ذات علم اور وہ بذاتہٖ قدرت ہے پس اس کی سب صفات مرکز وحدت میں باہم یگانگت رکھتی ہیں۔ البتہ ہم مانتے ہیں کہ ہم ایسی صفت سے عاری ہیں۔ لہٰذا ہمارے لیے اس مطلب

---

[1] معانی الاخبار شیخ صدوق صفحہ ۱۱ حدیث ۱۔

ومفہوم کو سمجھنا بہت مشکل ہے اور سوائے عقلی دلائل کے اس تک ہماری رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں۔

(۳) توحید صفات کی دلیل:

مخلوقات کی صفات میں گم ہو جانا اور توحید صفات کے مفہوم کو سمجھ نہ پانا ہی اس کا سبب بنا کر بہت سے ماہرین علم کلامِ صفات باری تعالیٰ کے بارے میں صحیح راستے سے دُور جا پڑے، ان میں سے ایک گروہ ''کرامیہ'' کا ہے جو محمد بن کرام سیستانی کے پیرو ہیں.....وہ کہتے ہیں کہ آغاز میں خدا کسی صفت سے متصف نہ تھا اور بعد کے زمانہ میں وہ تمام صفات کا مالک بنا ہے۔

یہ قول یہ گفتار اس قدر غلط ہے اور ناپسندیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ ایک شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ شروعات میں خدا عاجز وناتواں تھا اور بعد میں صاحب قدرت ہوا پھر یہ قدرت کس نے اسے دی اور کس نے اسے علم وآگاہی سے ہم کنار کیا؟

اس سلسلے میں یہ احتمال دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی مراد صفاتِ فعلی رہی ہیں۔ جیسے خالقیت اور رازقیت کہ جن کے لیے ضروری ہے کہ خدا کسی چیز پر قدرت ہونا، اس کو وجود میں لانے سے الگ ہے)۔

لیکن توحید صفات پر گفتگو کرنے کا صفاتِ سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہمارا رُوئے سخن خدائے تعالیٰ کی صفات ذات میں سے علم وقدرت کی طرف ہے، جیسا کہ آگے تفصیل سے بیان ہوگا۔ صفات ذات اور صفات فعل کا معاملہ باہم گرا لگ الگ ہے۔ صفات فعل ایسی ہیں کہ ہماری عقل افعال خداوندی کا مشاہدہ کرنے کے بعد ان سے واقف ہوتی اور اور انہیں ذات الٰہی سے نسبت دیتی ہے۔ (اس چیز کی شرح آپ کو اسی کتاب میں ملے گی)

آیات قرآن میں وحدت صفات کے اثبات کی طرف واضح ترین اشارہ (لیس کمثلہٖ شیءٌ) اور (قل ھو اللہ احد.....) ہے کہ جن کی تفسیر اوپر گزر چکی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ذاتِ مقدس میں کسی طرح کی دوئی کا گزر نہیں ہے۔

اس بارے میں عقلی دلائل کو رُو سے درج ذیل نکایت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے:

(۱) گذشتہ مباحث سے ثابت ہو چکا ہے کہ خدائے تعالیٰ ایک ایسا وجود ہے جو ہر جہت سے لامحدود ہے اس دلیل کے مطابق کوئی صفت کمال اس کے وجود سے باہر نہیں اور جو کچھ بھی ہے وہ اس کی ذات میں جمع ہے۔ اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری صفات حادث ہیں، یعنی ہم میں آہستہ آہستہ پیدا ہوتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم وجودی طور پر محدود ہیں اور اسی محدودیت کے باعث اوصاف وکمالات ہماری ذات سے باہر ہیں۔ کہ وقتاً فوقتاً ہم انہیں حاصل کرتے ہیں، لیکن ذات الٰہی کہ جو کمالِ مطلق ہے تو کوئی وصف کیونکر اس سے باہر تصورّ کیا جا سکتا ہے؟

(۲) اگر ہم اس کی صفات کے زائد بر ذات ہونے کے قائل ہو جائیں اور اس کی صفات مثل علم وقدرت کو اس سے الگ سمجھیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اسے مرکب یعنی جوہر وعرض بلکہ بہت سے عوارض کا مجموعہ تصور کیا جائے حالانکہ سابقہ بیانات میں ثابت ہو چکا ہے کہ اس کی ذات میں عقلی وخارجی کسی طرح کی ترکیب وتقسیم نہیں ہے۔

امیر المومنین امام علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے پہلے خطبے میں بڑے ہی لطیف انداز میں توحید صفات کی طرف اسی طرح اشارہ فرمایا ہے۔

وکمال الاخلاصِ لهٗ نفی الصفاتِ عنه ، لشهادة کل صفةٍ انها غیر الموصوفِ وشهادة کل موصوفٍ انه غیر الصفَةِ، فمن وصف الله سبحانهٗ فقدْ قرنَهٗ۔ ومن قرنهٗ فقد ثناهُ، ومن ثناهُ فقد جزأَهٗ، ومن جزأهٗ فقد جهلهٗ۔

کمال اخلاص یہ ہے کہ اس سے صفات کی نفی کی جائے۔ کیونکہ ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے، ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے، لہٰذا جس نے ذاتِ الٰہی کے لیے صفات تسلیم کیں اس نے ذاتِ کا دوسرا ساتھی مان لیا جس نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اس نے دوئی پیدا کی جس نے دوائی پیدا کی، اس نے اس کے لیے جز بناڈالا اور جس نے اس کے لیے جزء مان لیا وہ اسے جان نہیں سکا۔

امیر المومنینؑ اس مختصر سی عبارت میں نہایت مدلل طریقے سے خداوند تعالیٰ سے نفی صفات (جیسے ممکنات کی صفات جو زائد بر ذات ہیں) کے بعد واضح طور بیان فرماتے ہیں کہ جو خدا کی ایسی صفات کا قائل ہو وہ اسے قابلِ تقسیم یا مرکب تصور کرتا ہے اور یہ اس کی انتہائی جہالت اور معرفت سے دور ہونے کی علامت ہے۔

توحید در عبادت

اشارہ:

اقسام توحید میں سب سے اہم توحید در عبادت ہے، اس کے سوا ہم کسی کی پرستش نہیں کرتے، اس کے غیر کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے اور اس کے بغیر کسی کے آگے سر بہ سجود نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ دعوتِ انبیاء کی بنیاد اور آئین (اسلامی) کی پہلی شق یہی مسئلہ توحید در عبادت ہے، اور مشرکین کے ساتھ بحث و تکرار کا محور بھی یہی ہے۔

توحید عبادت، توحید ذات و صفات کا لازمہ ہے۔ کیونکہ جب یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ وہ واجب الوجود اور اس کا غیر ممکن الوجود اور محتاج ہے تو پھر اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ عبادت صرف اور صرف اسی کی ہو۔ وہی کمال مطلق ہے کوئی اور نہیں۔ عبادت کا مقصد کمال کی طرف جانا ہے لہٰذا عبادت اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ آیات قرآن دعوت توحید سے بھری ہوئی ہیں، ان میں دیئے گئے اس اہم پیغام تک رسائی کے لیے ہم چند آیات کا بطور خاص ذکر رہے ہیں اور اس ضمن کچھ اور آیتوں کو بھی سامنے لائیں گے۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن مجدی کے حضور پیش ہوتے اور آیات ذیل کا مطالعہ کرتے ہیں۔

(۱) وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۭ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ [۱۶:۳۶] (نحل)

(۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ (انبیاء)

(۳) لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ [۷:۵۹] (اعراف)

(۴) وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ [۹:۳۱]

(۵) قُلْ اِنِّىْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ

اَهۡوَآءَكُمۡ ۙ قَدۡ ضَلَلۡتُ اِذًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۵۶﴾

(انعام)

(۶) وَاعۡبُدۡ رَبَّكَ حَتّٰى يَاۡتِيَكَ الۡيَقِيۡنُ ﴿۹۹﴾ ﴿الحجر: ۹۹﴾

(۷) وَمَاۤ اُمِرُوۡۤا اِلَّا لِيَعۡبُدُوا اللّٰهَ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيۡنُ الۡقَيِّمَةِ ﴿۵﴾ ﴿البینة: ۵﴾

(۸) وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّىۡ وَرَبُّكُمۡ فَاعۡبُدُوۡهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِيۡمٌ ﴿۳۶﴾ ﴿مریم: ۳۶﴾

(۹) يٰعِبَادِىَ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِىۡ وَاسِعَةٌ فَاِيَّاىَ فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾ ﴿العنکبوت: ۵۶﴾

(۱۰) وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ كَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ﴿النور: ۵۵﴾

(۱۱) وَلَا يَاۡمُرَكُمۡ اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرۡبَابًا ؕ اَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡكُفۡرِ بَعۡدَ اِذۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۰﴾ [۳:۸۰] ﴿آل عمران: ۸۰﴾

(۱۲) وَلِلّٰهِ يَسۡجُدُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّكَرۡهًا وَّظِلٰلُهُمۡ بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ ﴿۱۵﴾ ﴿الرعد: ۱۵﴾

ترجمہ:

(۱) ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب برتیں، ان میں ایک گروہ کو خدا نے ہدایت دی اور ایک گروہ پر گمراہی چھا گئی، پس تم روئے زمین پر چلو پھرو، اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

(۲) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔

(۳) ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا اے میری قوم! تم لوگ صرف خدائے یگانہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (اگر تم کوئی اور راہ اپناؤ گے تو) میں تمہارے اوپر عذاب کے بڑے دن سے ڈرتا ہوں۔

(۴) انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ اس سے پاک ومنزہ ہے، جیسے وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔

(۵) (اے نبی) کہو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے، جنہیں خدا کے سوا تم پکارتے ہو، کہو کہ میں تمہاری ہوا وہوس کی پیروی نہیں کرتا، ایسا کروں تو گمراہ ہوجاؤں گا، اور ہدایت پانے والوں سے نہ ہوں گا۔

(۶) اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتا رہ..... یہاں تک کہ تجھے یقین (موت) آجائے۔

(۷) اور انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ اپنے دلوں کو خالص کرکے اور یکسو ہوکر اللہ کی بندگی کریں، نماز قائم کریں اور زکات دیں۔ یہی نہایت سیدھا اور صحیح دین ہے۔

(۸) اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

(۹) اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔

(۱۰) وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالح بجالاتے ہیں، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ یقیناً وہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطا کی تھی۔

(۱۱) وہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم انبیاء اور فرشتوں کو اپنے معبود بنالو، کیا وہ تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے۔ جب کہ تم مسلمان ہوچکے ہو۔

(۱۲) جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی یا مجبوری سے خدا کے لیے سجدہ ریز ہے۔ اسی طرح ان رات اور ان کے سائے (بھی سجدہ گزار ہیں)

مفردات کی تشریح:

''عبادت'' و ''عبودیت'' ہر دو کا معنی اظہار خضوع وفروتنی ہے۔

المفردات میں راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ ان ہر دو الفاظ کا عمیق ترین مفہوم یہ ہے کہ اس ذات کے سامنے انتہائی خضوع وعاجزی کرنا کہ جس کے انعام واکرام بے انتہا ہوں.....یعنی خداوند قدوس۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں لفظوں کی اساس لفظ ''عبدٌ'' ہے جس کا معنی ''بندہ'' ہے البتہ کبھی اس کا اطلاق ہر انسان پر ہوتا ہے خواہ وہ آزاد یا غلام ہو (جیسے لسان العرب وکتاب العین میں ہے) اس کی وجہ یہ ہے کہ سبھی انسان خدا کے بندے ہیں اور کبھی لفظ ''عبدٌ'' خاص طور غلام کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ راغب اصفہانی مزید کہتا ہے کہ ''عبدٌ'' کی چار اقسام ہیں:

(۱) ''عبدٌ'' بہ معنی غلام جن کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔

(۲) ''عبدٌ'' بہ معنی مخلوق۔

(۳) ''عبدٌ'' بہ معنی خادم جو مقام خدمت وعبودیت میں ہو، اس کی دو قسمیں ہیں۔

۔ بندہ خدا..... بندۂ دنیا.....لہٰذا کبھی عباد الرحمان کہا جاتا ہے۔ اور کبھی عبید الدنیا۔

(۴) مجمع البحرین میں ہے کہ ''عبدٌ'' کبھی حزب وگروہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جیسے۔

آیہ شریفہ: فادخلی فی عبادی (فجر۔۲۹) یعنی میرے بندوں کے گروہ میں داخل ہو جا یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ ''عبادت'' کی دو اقسام ہیں۔

(۵) عبادت اختیاری.....جس کا آیاتِ قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

(۲) عبادت غیر اختیاری.....جیسے قرآن میں آیا ہے۔ وان من شیءٍ الا یسبحُ بحمدِہٖ۔

(اسراء ۴۴) یعنی ہر موجود خدا کی حمد کر رہا ہے۔

مجمع البحرین میں طریحی کہتے ہیں، حکماء کے نزدیک عبادت کی تین قسمیں ہیں:

(۱) جسمانی عبادت.....جیسے نماز، روز.....

(۲) روحانی عبادت.....جیسے توحید، نبوت، معاد وغیرہم عقائد دینی پر یقین رکھنا۔

(۳) اجتماعی عبادت.....جیسے دشمن کے خلاف جہاد اور مجاہدین کی کمک کرنا۔

طاغوت ''مبالغے'' کا صیغہ ہے اور اس کا مادہ ''طغیان''[1] ہے جس کا معنی حد سے تجاوز ہے۔ لہٰذا لفظ طاغوت کا اطلاق ہر سرکش اور

---

[1] بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ یہ لفظ اصل میں ''طغوت'' تھا پھر لام الفعل کو عین الفعل کی جگہ لایا گیا اور ''واؤ'' ماقبل مفتوح ''الف'' میں تبدیل ہوا اور یہ ''طاغوت'' ہو گیا۔

متجاوز پر ہوتا ہے جیسے شیطان، جادوگر، ظالم حاکم اور غلط حاکم اور غلط راستے کو بھی طاغوت کہا جاتا ہے ہے، یہ لفظ مفرد و جمع ہر دو صورتوں میں مستعمل ہے۔

مجمع البیان میں طبرسی نے آیۃ الکرسی کی تفسیر میں ''طاغوت'' کے پانچ معنی ذکر کیے ہیں یعنی شیطان، کاہن، جادوگر سرکش جن و بشر بت......لیکن ظاہر ہے کہ ان تمام اقوال کی بازگشت، ایک ہی جامع مفہوم کی طرف ہے کہ جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا ہے۔

آیات کی جمع آوری تفسیر

معبود فقط وہی ہے:

(۱) پہلی آیت میں ''توحید عبادت'' کو تمام انبیاء کا بنیادی ہدف و مقصد قرار دیا گیا ہے، فرمایا: ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب برتیں۔

(ولقد بعثنا فی کل امۃٍ رسولاً ان اعبدوالله واجتنبو الطاغوت)

یہ قول ان لوگوں کے جواب میں ہے جن کا تذکرہ اس سے پہلی آیت (۳۵ نحل) میں آیا ہے، ان کا کہنا تھا کہ خدا یہ چاہتا ہے وہ ہم بت پرستی کریں اور وہ ہمارے اس عمل پر راضی ہے۔ ان کے اس بے اصل نظریئے کے رد میں قرآن کہتا ہے ''بلا استثناء تمام انبیاء کی دعوت و تبلیغ وعبادت خدا کے لیے تھی سبھی نے غیر خدا کی پرستش سے روکا، یہ کیسی جھوٹی نسبت ہے جو تم خدا کی طرف دے رہے ہو، پھر فرماتا ہے کہ ''انبیاء کی دعوت کے بعد لوگوں کے دو گروہ بن گئے...... پہلا گروہ ان کا مخالف تھا جس پر گمراہی چھا گئی۔(ومنھم من حقت علیہ الضللۃ)

پھر حکم دیا جارہا ہے، پس تم روئے زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا(فسیروا فی الارض فانظرو کیف کان عاقبۃُ المکذِبین) ہاں یہ لوگ توحید سے منہ موڑ کر طاغوت کے سامنے سجدہ ریز ہوئے۔ تو گمراہی کی بدبختیوں نے انہیں گیر لیا اور وہ تاریکیوں میں ڈوب گئے۔ یوں عذاب الٰہی نے انہیں آ پکڑا۔

یہاں ایک نکتہ لائق توجہ ہے کہ لوگوں کے ہدایت پانے کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے کیونکہ جب تک اس کی توفیق اور امداد شامل حال نہ ہو، کوئی شخص اپنی ہمت سے منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا اس کے مقابلے گمراہی کی نسبت خود ان لوگوں کی طرف ہے کہ یہ ان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ تھا۔

(۲) دوسری آیت میں اسی چیز کا ذکر ایک اور انداز سے ہورہا ہے جو ایک قاعدہ کلیہ اور اصل دائمی کی صورت میں ہے، جیسا کہ فرماتا ہے: ''ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا کہ جس کی طرف یہ وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو، (وما ارسلنا من قبلك من رسولٍ الانوحی الیہ انہ لاالہ الاانا فاعبدونِ)

توجہ رہے کہ ''نوحی'' فعل مضارع ہے جو ''استمرار ودوام'' کی دلیل ہے یعنی ''توحید عبادت'' کا دائمی حکم سب انبیاء کو دیا گیا اور سب کی دعوت کا بنیادی اصول یہی تھا وہ اپنی پوری دعوت میں یہ پیغام پہنچانے اور اسی کی تبلیغ کرنے پر مامور تھے لہٰذا مسئلہ ''توحید عبادت'' ایک قاعدہ

کلیہ اور اساس و بنیاد کے طور پر تمام انبیاء کے وقتوں میں پیشِ نظر اور ریزعمل رہا ہے۔

(۳) تیسری آیت میں سب سے پہلے اولوالعزم پیغمبر شیخ الانبیاء نوحؑ کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان کی دعوت کے آغاز سے اختتام تک توحیدِ عبادت اور بتوں سے دوری کے سوا کوئی اور مسئلہ امیت نہیں رکھتا تھا، جیسا کہ فرماتا ہے ہے: ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا، انہوں نے کہا کہ اے میرے قوم! تم لوگ صرف خدائے یگانہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (لقد ارسلنا نوحاً الیٰ قومیه فقال یٰقومِ اعبدو الله مالکم من الهٍ غیرهٗ)

اس جملے سے بخوبی طاہر ہوتا ہے کہ بت پرستی سعادت انسانی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے یہی وجہ ہے کہ باغ توحید کے باغبان پیغمبروں نے رُوح انسانی کی سرزمین میں فضیلت کے پھولوں کی آبیاری اور پورش کے لیے ہر کام سے پہلے گمرہ ہمت باندھی تا کہ توحید کے ہتھوڑے سے اس راستے کے پتھر کو چکنا چور کر دیا جائے، خاص طور پر حضرت نوح کے زمانے میں قسم قسم کے بت موجود تھے جیسا کہ سورۂ نوح کی آیت ۲۳ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ودّ سواع، یغوث، یعوق اور نسر سمیت پانچ مشہور بت تھے، جو بالترتیب مرد، شیر، گھوڑے اور باز کی شکل میں تھے۔ وہ لوگ ان کی پرستش کرتے اور اس پر فخر بھی کیا کرتے تھے۔

جب حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ یہ لوگ بت پرستی پر اصرار کرتے ہیں تو آپ نے انہیں عذاب الٰہی سے ڈرایا جیسے اس آیت کے آخر میں ہے، تمہاری اس گمراہی اور بت پرستی کی وجہ سے میں ''تمہارے اُوپر عذاب کے بڑے دن سے ڈرتا ہوں، ظاہری طور پر عذابِ عظیم سے مراد وہی تباہ کن طوفان تھا جس نے اس قوم کو گھیر لیا سابقہ اقوام میں سے کسی کو ایسا عذاب نہ ہوا تھا کہ جو اس قدر وسیع اور ہمہ گیر ہو اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس سے قیامت کے دن کا عذاب مراد ہے۔ (انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم [۱])

تفسیر المیزان میں ہے کہ اس چھوٹی سی آیت میں اصول دین میں سے دو اصلوں کا یکجا ذکر ہوا ہے۔ یعنی توحید اور معاد [۲]

تیسری اصل یعنی نبوت کا ذکر (یعقوم لیس بی ضلالة) میں آیا ہے۔

چوتھی آیت میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے جو راہ توحید سے منحرف ہو چکے ہیں۔

یہود نے اپنے اخبار (علماء دین اور نصاریٰ نے راہبوں (تارک دنیا افراد) اور حضرت مسیحؑ کو معبود قرار دے رکھا ہے، پھر کہتا ہے یہ سب کچھ انہوں نے اس کے باوجود کیا ہے کہ اُنہیں خدائے واحد کے علاوہ کسی کی پرستش کرنے کا حکم نہیں دیا گیا (وما امروا الالیعبدو اِلٰهاً وّاحِدًا) پھر مزید تاکید کے لیے فرماتا ہے (لاالٰهَ الاهو) یعنی اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اس کے ساتھ ہی بار دیگر تاکید کے طور پر فرمایا: وہ اس سے پاک و منزہ ہے جسے اس کا شریک قرار دیتے ہیں۔ (سبحانه هما یشرکون) بہرحال یہ آئین و دستور کہ جس کی بنیاد حضرت نوحؑ نے رکھی، ان کے بعد ہونے والے اولوالعزم پیغمبروں .....حضرت موسیٰؑ

---

[۱] یہ دونوں تفسیریں مفسرین کے ہاں واضح طور پر ذکر ہوئی ہیں، ان میں سے تفسیر فخر رازی جلد ۱۴ صفحہ ۱۴۹ میں زیرِ بحث آیت کے ذیل میں ان کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

[۲] تفسیر المیزان جلد ۸ صفحہ ۱۸۰۔

وحضرت عیسیٰؑ..... نے بھی پوری کوشش سے اسے رواج دیا اور آگے بڑھایا۔

یہ صحیح ہے کہ مسیحی لوگ حضرت مسیحؑ کی پرستش کرتے تھے اور کر رہے ہیں۔لیکن نہ تو یہودی اپنے احبار کی پرستش کرتے اور نہ مسیحیٰ اپنے راہبوں کی پرستش کرتے تھے مگر اس لیے کہ وہ دین میں ان افراد کی طرف سے کی گئی تحریفوں کے باوجود بلاقید وشرط ان کی اطاعت وپیروی کرتے تھے۔ان کے اس عمل کو بت پرستی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی بناء پر احادیث میں آیا ہے: اما واللہ ما صاموا لھم ولا صلوا ولکنھم احلوا لھم حراماً وحرموا علیھم حلالا فاتبعوھم وعبدُوھم من حیث لا یشعرون[1]

یعنی آگاہ رہو کہ بخدا وہ (یہود ونصاریٰ) اپنے مذہبی پیشواؤں کے لیے نہ روزہ رکھتے اور نہ نماز پڑھتے تھے،لیکن یہ کہ وہ پیشوا اپنے پیروکاروں کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیتے۔پس وہ ان کی پیروی کرتے اور یُوں وہ ان کی پرستش کرتے تھے جب کہ وہ جانتے نہ تھے۔اس موضوع کی مزید تشریح انشاءاللہ ''توحید اطاعت'' کی بحث میں آئے گی۔

میں غیر خدا کی پرستش نہیں کرتا:

(۵) پانچویں آیت میں ''توحید عبادت'' کے سلسلے میں بات پیغمبر اکرمؐ تک آ پہنچی ہے اور خداوند تعالیٰ انہیں حکم دیتا ہے: (اے نبی) کہو کہ مجھے ان کی پرستش سے منع کیا گیا ہے جنہیں خدا کے سوا تم پکارتے ہو (قل انی نھیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ)۔

''الذین'' کی تعبیر جو عام طور جمع مذکر عاقل کے لیے آتی ہے۔یہ مشرکوں کے معبودوں کے لیے یا تو اس وجہ سے آئی ہے کہ وہ لوگ اپنے وہم وگمان میں بتوں کو عقل وروح سے متصف تصور کرتے تھے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے معبودوں میں مسیحؑ،فرشتوں اور جنوں جیسی ذی شعور شخصیات شامل تھیں۔

پھر یہ بتانے کے لیے کہ خدا کی طرف سے پیغمبر کو غیر خدا کی پرستش سے منع کرنے کی دلیل کیا ہے؟ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتا ہے: کہو کہ میں تمہاری ہوا وہوس کی پیروی نہیں کرتا ایسا کروں تو گمراہ ہو جاؤں گا اور ہدایت پانے والوں میں سے نہ ہوں گا۔(قل لا اتبع اھواء کم قد ضللت اذاً وما انا من المھتدین)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ بت پرستی کی بنیاد یں خواہشوں کی پیروی اور وہم وخیال ہی پر کھڑی ہوا کرتی ہیں یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خواہشوں کے پیچھے چلنے کا نتیجہ گمراہی ہے اور اس طریقے سے نیک بختی اور راہ راست ہرگز نصیب نہیں ہوتی۔

(۶) چھٹی آیت میں بھی رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ ہی کی طرف ہے،انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدائے یگانہ کی عبادت کرنے اور شرک وبت پرستی کی ہر شکل سے دوری پر ثابت قدم رہیں جیسا کہ فرماتا ہے اور اپنے پروردگار کی عبادت کرتا رہ..... یہاں تک کہ تجھے یقین

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۲ صفحہ ۲۰۹۔

(موت) آ جائے (واعبد ربك حتیٰ یاتیك القین)

مفسرین نے عمومی طور پر زیر بحث آیت میں آنے والے لفظ ''یقین'' کو ''مرگ'' کے معنی میں تصور کیا ہے۔ اور اس حضرت عیسیٰؑ کی گفتار کے مشابہ قرار دیا ہے خدا نے مجھے نماز وزکات کی وصیت کی ہے جب تک کہ میں زندہ ہوں، (واوصانی بالصلوٰۃ والزکاتِ مادمت حیاً).....(مریم۔۳۱) اور قرآن میں ایک اور مقام پر ہم اہل دوزخ کا قول دیکھتے ہیں (وما کنا نکذب بیوم الدین حتیٰ اتانا الیقینُ) یعنی ہم قیامت کے دن کا متواتر انکار کرتے رہے، یہاں تک کہ ہماری موت آ پہنچی۔

اسلامی روایت میں بھی مرگ کو ''یقین'' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ہم امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: لم یخلق اللہ یقیناً لاشك فیہ اشبہُ بشكٍ لا یقین فیہ من الموتَ۔

خدا نے ایسا کوئی یقین پیدا نہیں کیا کہ جس میں شک کی آمیزش نہ ہو، مثلاً موت کہ اس میں اس طرح شک رہتا ہے، گویا اس کے ساتھ یقین کا ہرگز تعلق نہیں ہے (یہ اس لیے فرمایا کہ لوگ موت سے یوں بے پرواہیں کہ موت کی آمد کو باور نہیں کرتے) [1]

موت کو یقین سے تعبیر کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے، جیسے مذکورہ بالا حدیث میں آیا ہے کہ سبھی انسان موت پر یقین رکھتے ہیں اور اس میں کسی مذہب ومسلک کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے یا اس کی وجہ یہ ہے کہ موت کے وقت (غفلت کے) پردے اُٹھ جاتے ہیں اور حقائق آشکارا ہو جاتے ہیں، اس طرح ایسے بہت سے امور کا یقین ہو جاتا ہے جن کے بارے میں انسان اس سے پہلے شک وشبہ میں رہا کرتا ہے (بہرحال ان دونوں تفسیروں میں جمع بھی ممکن ہے۔

(۷) ساتویں آیت میں یہی مضمون بعض اضافوں کے ساتھ سامنے آتا ہے اس میں اہل کتاب کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہوا ہے جو مرکز توحید سے منحرف ہو کر عبادت وعبودیت میں خدا کے ساتھ دیگر شرکاء کے قائل ہو گئے۔ ارشاد ہوتا ہے اور انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ اپنے دلوں کو خالص کر کے اور یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں۔ (وما اُمرُوا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین حنفاءَ [2])

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تمام ادامر الٰہی کو مخلصانہ عبادت میں شامل کرنے کے بعد نماز قائم کرنے اور زکات دینے کا حکم فرمایا ہے (ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام احکام دینی کی اساس وبنیاد عبادت میں اخلاص پر قائم ہوتی ہے پھر یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ آیت کے آخر میں یہ اضافہ کرتا ہے، یہی نہایت سیدھا اور صحیح دین ہے، (وذلك دین القیمۃ [3])

---

[1] تحف العقول صفحہ ۲۷۱۔

[2] المفردات میں راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ ''حنف'' بروزن ''کتف'' کا معنی ضلالت وگمراہی کو ترک کر کے سیدھے راستے پر آجانا ہے دینِ اسلام کو بھی اسی لیے دینِ حنیف کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو صراطِ مستقیم سے گمراہی کی طرف جانے سے باز رکھتا ہے۔

[3] المفردات میں راغب اصفہانی کا قول ہے کہ ''قیم مادۂ'' ''قیام'' سے قیام ثابت اور مستقیم کے معنی میں ہے، یہاں یہ لفظ ایسی اُمت کے لیے ہے جو عدل وانصاف کے لیے قیام کرتی ہے۔ جیسے آیت کونو قوامین بالقسط میں آیا ہے۔

(۸) آٹھویں آیت میں یہی نکتہ حضرت عیسیٰؑ کی زبانی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا: (اللہ ہی میرا اور تمہارا پروردگار ہے، اسی کی عبادت کرو کہ یہی سیدھا راستہ ہے (وان اللہ ربی وربکم فاعبدوہُ ھذا صراطٌ مستقیمٌ)

ہم جانتے ہیں کہ دو نقطوں کے درمیان خطِ مستقیم ایک ہی ہوتا ہے جب کہ غیر مستقیم اور ٹیڑھے خطوط بہت سے ہو سکتے ہیں، خط توحید بھی بس ایک ہی ہے، اس کے علاوہ جو کچھ ہوگا وہ شرک و بت پرستی میں داخل سمجھا جائے گا۔

''مستقیم کا مادہ'' استقامت'' ہے اور اصل میں یہ ''قیام'' سے لیا گیا ہے۔ چونکہ انسان کھڑے ہونے کی حالت میں بالکل سیدھا ہوتا ہے، اس لیے یہ لفظ ہر قسم کے انحراف سے مبرا صاف سیدھے اور معتدل راستے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن نے سورۂ حمد میں ''صراطِ مستقیم'' کے مقابل ''مغضوب علیہم) وہ لوگ جن پر خدا کا غضب ہوا اور (ضالین) جو گمراہ ہوئے ان کا ذکر کیا ہے۔ پہلے گروہ میں وہ گمراہ لوگ ہیں جو اپنی گمراہی پر اڑے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی اور دوسروں کی گمراہی کو درست قرار دیتے اور اس پر اصرار کرتے ہیں۔ دوسرے گروہ میں ایسے گمراہ لوگ شامل ہیں جو بے خبر اور سادہ دل ہیں کہ اوروں کی دیکھا دیکھی اس راہ پر چل رہے ہیں۔

جس جگہ خدا کی عبادت نہ کر سکوں وہاں سے ہجرت کر جاؤ:

(۹) نویں آیت میں ایک نئے نکتے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی ایک وطن یا مقام جس کے ساتھ محبت ہے اگر اس میں سکونت رکھنا خدا کی عبادت میں مانع ہو (توحید عبادت پر عمل نہ ہو سکے) تو اس مقام اور وطن سے ہجرت کو جانا چاہیے۔ جیسا کہ فرمایا۔ اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو، میری زمین وسیع ہے۔ پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔ (یعبادی الذین اٰمنوا ان ارضی واسعۃٌ فایای فاعبدونِ)

ہاں! خدا کی زمین وسیع ہے۔ لہٰذا کسی وقت بھی گھر، وطن اور کنبہ، برادری میں رہنے کی مجبوری یا ان کی محبت کے باعث شرک و بت پرستی کے ماحول میں رہ کر خدا کی بندگی اور توحیدِ عبادت کے اہم فریضے کو ترک نہ ہونے دیا جائے بلکہ ہر مومن و موحد کا وظیفہ و ذمہ داری ہے کہ ایسی حالت میں وہ اس جگہ سے ہجرت اختیار کرے اور ایسی سرزمین پر چلا جائے جہاں چراغ توحید ضوفشاں ہو، تاکہ آغازِ اسلام میں ہجرت کرنے والے مہاجرین کی طرح اپنے دامن کو شرک و بت پرستی سے آلودہ نہ ہونے دے اور ضروری قوت و طاقت فراہم کر کے اپنے وطن مالوف میں لوٹ آئے۔

اس آیت میں (یا عبادی) اے میرے بندو (ارضی) میری زمین (فایای فاعبدونِ) پس تم میری ہی بندگی کرتے رہو۔ یہ سب ایسی تعبیرات ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں خدا کی رحمت شامل ہے جو موحدوں اور توحید پرستوں پر ہر جگہ اور ہر حال میں سایہ فگن

رہتی ہے اور اس ذاتِ مقدس کی حمایت ان کے ساتھ ہوتی ہے [1]

توجہ رہے کہ اس آیت میں مخاطب خدا کے عباد یعنی اس کے بندے ہیں لیکن پھر سے انہیں خدائے واحد کی عبادت و پرستش کا حکم دیا جارہا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہیں تا زندگی توحید پرستی لے راستے پر گامزن رہنا چاہیے اور اسے ذرہ بھر انحراف نہ کرنا چاہیے یہ اعادہ تکرار ایسا ہی ہے جیسے خدا کے بندے باوجود راہ ہدایت کی پیروری کرنے کے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾ ''یعنی ہمیں سیدھی راہ پر قائم رکھ۔ کہہ کر اس سے ہر دم طلب ہدایت وتوفیق کرتے رہتے ہیں۔ تا کہ ان کے عمل میں کوئی کجی وخامی پیدا ہونے نہ پائے۔

زیر بحث آیت سورہ عنکبوت کی ہے اور مفسرین کہتے ہیں کہ اس سورے کی پہلی گیارہ آیتیں مدینہ میں نازل ہوئی، یہ مکہ کے ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو اظہار اسلام تو کرتے تھے لیکن مدینہ کی طرف ہجرت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اس سے اگلی آیت (کل نفسٍ ذائقة الموت) بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ آخر کار سبھی کو مرجانا ہے۔ زن وفرزند اور مال ووطن سے جدا ہونا ہے۔ پس ہجرت سے پہلو تہی کرنے والے یہ لوگ سمجھ لیں کہ اس طرح وہ اپنے کنبہ مال اور وطن سے ہمیشہ آسودہ خاطر نہیں رہ سکیں گے بلکہ موت انہیں ان سب سے جدا کر دے گی، پس ان کا ہجرت نہ کرنا غلط فہمی اور نادانی کی بات ہے کیونکہ وہ مکہ میں بھی ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ [2]

(۱۰) دسویں آیت میں بھی ایک نئے نکتے کا ذکر ہوا ہے اس میں سارے مومنین کو یہ نوید دی جارہی ہے۔

کہ تم روئے زمین کے ملکوں کے مالک وحاکم بن جاؤ گے جیسا کہ توحید نے ساری کائنات کو روشن کر دیا ہے اور خدا کے سوا کسی اور معبود کی عبادت نہیں ہوسکتی اس بیان میں مومنین کو توحید پر ایمان لانے اور توحید عبادت پر قائم رہنے کے باعث تبریک اور خوشخبری دی جارہی ہے جیسا کہ فرمایا ''وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمال صالح بجالاتے ہیں۔ ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ یقیناوہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ جیسے اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلافت عطاء کی تھی (وعدہ الله الذين امنو منكم وعملو الصٰلحٰتِ ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم)۔

جولوگ اس سے پہلے زمین کے وارث بنے وہ کون تھے؟ اس میں مفسرین نے بہت کچھ بحث وگفتگو کی ہے لیکن ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ اس سے مراد بنی اسرائیل ہی ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے قیام اور فرعون کی تباہی وغرقابی کے بعد اس زمانہ میں آباد زمین کے بہترین خطوں اور علاقوں کے مالک وحاکم بنے تھے جیسے قرآن مجید سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۷ میں بیان فرماتا ہے (واورثنا القوم الذين كانو يستضعفون مشارق الارض ومغاربها التى باركنا فيها) یعنی ہم نے ایک کمزور جماعت (بنی اسرائیل) کو (خدا پر ایمان لانے اور اخلاص ظاہر کرنے کے بعد) مشرق ومغرب کی پر برکت زمین کا وارث وحاکم بنایا

(۱۱) گیارہویں آیت میں ایک اور پہلو سے توحیدِ عبادت کی توجیہ کی گئی ہے وہ اس طرح کہ مجسمے اور مورتیاں تو مٹی اور پتھر کے بے

---

[1] فایای فاعبدون من مفعول کا ذکر پہلے ہوا ہے۔ جو حصر کا فائدہ دیتا ہے یعنی عبادت صرف اور صرف خدا ہی کی ہے اور اس کے سوا کوئی اور دوسرا لائق عبادت و پرستش نہیں ہے۔

[2] تفسیر روح البیان، تفسیر روح المعانی، تفسیر قرطبی میں آیت زیر بحث کے ذیل میں اسی طرف اشارہ ہوا ہے۔

حقیقت ٹکڑے ہیں ان کا تو کیا ذکر خود ملائکہ مقربین اور انبیاء و مرسلین بھی یہ منزلت نہیں رکھتے کہ ان کی عبادت و پرستش کی جائے ۔فرماتا ہے وہ تمہیں حکم نہیں دیتا کہ تم ابیاء اور فرشتوں کو اپنے معبود بنالو کیا وہ تمہیں کفر کی طرف دعوت دیتا ہے جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔(ولا یامرکم ان تتخذوا الملئکۃ والنبیین ارباباً ایامرکم بالکفر بعد اذانتم مسلمون)[1] بھال اور پرورش میں کوشاں ہو جیسا کہ رب الدار ''رب الابل'' جن کا مطلب گھر اور انٹوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کرنے والا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ غیر خدا کے لیے بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورۂ یوسف کی آیت ۴۲۔۵۰ میں لفظ ''رب'' مصر کے بادشاہ کے لیے آیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں عموماً اس لفظ کو بڑے لوگوں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

لیکن قرآن میں لفظ ''رب'' سینکڑوں مرتبہ آیا اور قریباً ہر مقام پر اس سے خدائے تعالیٰ کی ذات مقدس ہی مراد ہے کیونکہ درحقیقت ہر چیز کا مالک اور پرورش کرنے والا وہی ہے یہاں اہم بات یہ ہے کہ بہت سی اقوام کچھ چھوٹے خداؤں کی قائل رہی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو ''رب النوع'' کہتی اور خداوند تعالیٰ کو رب الارباب'' (خداؤں کا خدا) کہتی ہیں۔اسی طرح بعض قومیں انبیاء اور فرشتگان کے متعلق بھی یہی عقیدہ رکھتی ہیں۔لیکن مذکورہ بالا آیات ان باطل عقائد کی صریحاً نفی کرتے ہوئے ثابت کر رہی ہیں کہ ''رب'' اور رب الارباب'' خدائے قدوس ہی ہے۔اس کے علاوہ کسی کو ''رب'' تصور کرنا اور ماننا کفر محض اور اسلام کے خلاف ہے۔

(۱۲) بارہویں اور آخری آیت میں اس تمام بحث کے نتیجے کے طور پر فیصلہ کن گفتگو کی گئی ہے، کہ توحید عبادت صرف انسانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ''جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی یا مجبوری سے خدا کے لیے سجدہ ریز ہیں، اسی طرح دن رات اور ان کے سائے بھی سجدہ گذار ہیں۔(واللہ یسجد من فی السمٰوٰتِ والارض طوعاً و کرھا وظللھم بالغدُووالاصالِ)۔

اگرچہ لفظ ''من'' باشعور مخلوق کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس سے بعض مفسرین نے خیال کیا کہ آیت میں انسانوں اور فرشتوں کی عبادت کا تذکرہ ہوا ہے لیکن اس آیت کی ایک اور قرائت بھی ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عاقل وغیرہ عاقل جمادات، حیوانات، نباتات.....تمام موجودات کی طرف اشارہ ہے اور سجدہ بھی عام داخل ہے جو انسان اور دیگر ذی شعور مخلوق بجالاتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے:

(۱) طوعاً و کرہاً (خوشی و مجبوری) سے ظاہر ہے کہ سجدہ کے عمومی معنی مراد ہیں۔

(۲) ظلال (سایہ) کی شرکت بتاتی ہے یہاں عمومی عبادت کا ذکر ہے۔

(۳) دیگر آیات میں یہ بات واضح طور پر آئی ہے۔

زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے وہ خدا کے حضور سجدہ ریز ہے۔

---

[1] اس بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۴ صفحہ ۵۲۷ (فارسی) میں حکومت جہاں مستضعفان کے عنوان سے مفصل بحث ہوئی ہے اس کا ایک نمونہ فتح مکہ کے بعد پیغمبر اکرم کی حکومت کی شکل میں سامنے آیا اور اس کا مکمل ترین نمونہ حضرت قائم آل محمدؑ (ارواحنا فداہ) کے ظہور کے وقت ساری دنیا دیکھے گی جو کمزوروں کی عالمی؟ حکومت ہوگی۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴿النحل: ۴۹﴾

درخت اور ستارے سجدہ کرتے ہیں۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ۶ ﴿الرحمن: ۶﴾

معلوم ہوا کہ تمام موجودات عالم خدائے تعالیٰ کے سامنے سربہ سجود ہیں اور تکوینی طور پر اس کی فرمانبرداری کررہے ہیں۔ان میں مومنین سجدہ تکوینی کے علاوہ سجدہ تشریعی بھی کررہے ہیں جو ان کے ارادہ واختیار سے تعلق رکھتا ہے۔[1]

اس سجدہ کی عمومیت یہاں تک کہ اس میں ظلال اور سایوں کی شرکت واقعاً حیرت انگیز ہے کیونکہ وہ عدم کا پہلو رکھتے ہیں، دراصل سایہ اس جگہ پر ہوتا ہے۔ جہاں روشنی نہ پہنچ رہی ہو۔لیکن اس بناء پر کہ سایہ اجسام کے تابع ہے،اس میں وجودی پہلو بھی پایا جاتا ہے۔قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ سائے جو مشابہ وجود ہیں وہ بارگاہ الٰہی میں سجدہ کررہے ہیں تو پھر حقیقی موجودات کی سجدہ گزاری میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔مشہا بہت کا اصلیت سے ایک طرح کا تعلق ہوتا ہے،جیسا کہ ہم کہتے ہیں فلاں شخص کی فلاں سے ایسی شدید دشمنی ہے کہ وہ اس کے سائے پر بھی تیر بارانی کرتا ہے۔علاوہ ازیں سائے عموماً زمین پر ہوتے ہیں اور ان کی اس حالت کو سجدے سے تعبیر کرنا ان کی کیفیت کی بڑی عمدہ تصویر کشی ہے۔

سائے ساتھ یہ جو صبح وشام (بالغدو والاصالِ) کا ذکر ہوا ہے۔تو ممکن ہے یہ سائے کا وصف ہو اور ان دو وقتوں کا انتخاب اس لیے کیا کہ ان میں ہر چیز کا سایہ طویل ہوتا ہے جب کہ دوپہر کے وقت سایہ نسبتاً چھوٹا اور بعض اوقات معدوم بھی ہوتا ہے اس میں یہ احتمال بھی ہے کہ صبح وشام کا ذکر موجودات عالم (آسمانی وزمینی) کے وصف میں آیا ہو اور اس کا مقصد سجدے کا دوام ظاہر کرنا ہو، جیسے ہم روزمرہ کی گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں کے کان میں صبح وشام یہ بات پہنچانا چاہیے۔یعنی یہ بات اس سے ہمیشہ کہتے۔

ان آیات کی جمع آوری اور تفسیر سے یہ نتیجہ برآمد ہورہا ہے کہ توحید عبادت اتنی اہم چیز ہے کہ انبیاء کی دعوت کا آغاز اسی سے ہوا اور یہی ان کی تعلیمات کا اصل اصول تھا۔نیز اولوالعزم انبیاء کی دعوت وتبلیغ کی بنیاد اسی پر قائم ہوئی اور رسول کریمؐ بھی تاحین حیات مختلف پیرایوں میں اس کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔

توحید عبادت ہی صراطِ مستقیم کی طرف لے جانے والا وسیلہ ہے، یہاں تک کہ بشرط ضرورت اس کی خاطر ترک وطن کرنا اور شرک وبُت پرستی کے ماحول کو چھوڑ کر وہاں سے ہجرت کرجانا چاہیے۔

وہ وقت جب عادلانہ الٰہی حکومت اس دنیا میں قائم ہوگئی۔اس کی اہم خصوصیات میں سے بڑی خصوصیت توحیدِ عبادت ہے جو سارے جہان میں ظہور پذیر ہوگئی۔اس بابرکت عہد میں نہ صرف انسان بلکہ تمام موجوداتِ عالم خدائے یگانہ کے آستان پر جبین سائی

---

[1] پہلی صورت میں جارومجرور کا تعلق ایک مقدر فعل یا وصف سے ہے (اس کا امتیاز اقرب کی طرف لوٹنا ہے) دوسری صورت میں جارومجرور کا تعلق یسجد کے فلع سے ہے اس کا امتیاز یہ ہے کہ خود مذکور ہے۔

کریں گے اگرچہ وہ زبان قال سے تسبیح نہ کریں، اور اپنے اختیار سے سجدہ نہ کریں تو بھی زبانِ حال سے اس کی تسبیح اور تکوینی طور پر اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں گے۔

توضیحات

(۱) توحید عبادت کا شجر میوہ دار:

اس نکتے پر توجہ دینا ضروری ہے کہ خضوع خشوع اور ادب واحترام کے کئی مراتب ہیں، ان میں سے سب سے اعلیٰ اور آخری درجہ یہی عبادت و پرستش ہے۔

یہ ایک واضح سی بات ہے کہ اگر کوئی انسان کسی کے لیے اس قدر احترام کا قائل ہو کہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے گر جائے۔ سرزمین پر رکھ دے اور سجدہ ریز ہو جائے تو لازماً وہ اس کے فرمان پر سر تسلیم خم کر دے گا۔ کیا ممکن ہے کہ وہ اس کی لامحدود تعریف اور پرستش کرنے کے باوجود اس کا حکم نہ مانے؟ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی انسان عبادتِ خالص کی روح سے واقف ہو جائے تو گویا اس نے خدا کی اطاعت کی طرف بہت بڑا قدم اُٹھایا، اس نے نیکیاں کمانے اور برائیوں سے بچنے کا راستہ اپنا لیا ہے اس طرح کی عبادت اگر استمرار و ہمیشگی رکھتی ہو تو یہ انسان کی روحانی تربیت اور تکامل کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی قسم کی مخلصانہ عبادت اگر استمرار و ہمیشگی رکھتی ہو تو یہ انسان کی روحانی تربیت اور تکامل کا سبب بن جاتی ہے۔

اسی قسم کی مخلصانہ عبادت میں عشقِ محبوب بھی شامل ہوتا ہے جو عبادت کرنے والے کو اس معشوقِ حقیقی کی سمت لیے لیے جاتا ہے اور اس کمال مطلق کی طرف یہ حرکت وسفر بدی کی پستیوں اور گناہ کی آلودگیوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنتا ہے اس بناء پر توحید عبادت کا مسئلہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کہ قرآن نے اس کا واضح اعلان کرنا ضروری سمجھا.....(ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین مومن۔ ۶۰) یعنی جو لوگ میری عبادت سے سر پھیرتے ہیں وہ جلد ہی ذلت کے ساتھ جہنم میں وارد ہوں گے۔

عبادت کرنے والا شخص اپنے انتہائی عجز و دل سوزی کے ساتھ خدا کی رضا و تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ وہ جانتا اور مانتا ہے کہ قرب خداوندی عمل ہی کے ذریعے نصیب ہو سکتا ہے، لہٰذا وہ اس کے ہر حکم و فرمان کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے توحیدِ عبادت پر اعتقاد رکھنے اور خدا کی عبادت بجالانے والا بندہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ خدا کو اپنا معبود اور معشوق بنانے کا میاب ہو جائے۔ اس لیے وہ اس کی صفات کمال و جمال کو اپنے وجود پر منعکس کرنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ طریقہ عمل انسان کی اصلاح اور اس کے تکامل میں اتنا موثر ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں۔

۲۔رُوح عبادت اورافراط وتفریط سے پرہیز:

اکثر مسائل کی طرح عبادت کے معنی میں بھی افراط وتفریط پیدا ہوگئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں نے (مالکیت وربوبیت کا تصور نہ رکھتے ہوئے) غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز قرار دے دیا ہے اور اس کے لیے فرشتوں کے سجدہ برائے آدمؑ اور برادران یوسف کے سجدہ برائے یوسفؑ کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔اس کے مقابل کچھ لوگوں نے پیغمبر اکرمؐ وائمہ دین کی طرف ہر قسم کی توجہ،توسل اور طلب شفاعت کو شرک اور ایسا کرنے والے کو مشرک کہا ہے،لیکن درحقیقت یہ دونوں نظریئے صحیح نہیں ہیں۔

اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے۔جیسا کہ اس بحث کے آغاز میں بتایا جاچکا ہے کہ علماء لغت کی تشریح کے مطابق حقیقت عبادت معبود کے سامنے خضوع وخشوع، بے انتہا تواضع اور تذلل ہے اسلامی نظریئے کی رو سے یہ سب کچھ خدا کے لیے مخصوص ہے اور کسی دوسرے کے سامنے ایسا کرنا شرک درعبادت ہوگا۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خضوع کے مختلف مراتب ہیں مثلاً دستوں کے سامنے خضوع کہ اس کے قابل تکبر ہے اس طرح باعظمت افراد کے لیے خضوع اوران میں پہلا مقام والدین کا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا نرمی اور ملائمت کے ساتھ ان کے سامنے جھکے رہو۔(وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ ﴿الإسراء: ۲۴﴾

خضوع اور عجز کا اس سے بالاتر مرحلہ وہ ہے جو پیغمبروں اور معصوم اماموں کے لیے انجام دیا جانا چاہیے۔

حتیٰ کہ مُسلمانوں کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ اپنی آواز پیغمبر اکرمؐ کی آواز سے بلند تر کریں۔اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو تم اپنی آواز پیغمبر اکرمؐ کی آواز سے بلند نہ کرو۔ان کے سامنے اونچی آواز سے بات نہ کرو جیسے تم میں سے بعض افراد دوسروں کے ساتھ کیا کرتے ہیں(یاایھاالذین اٰمنو الا ترفعوا صواتکم فوق صوتِ النبی ولا تجھروالہٗ بالقول کجھرِ بعضکم لبعضٍ)۔(حجرات۔۲)

لیکن خضوع اور کسی کے سامنے جھکنے،تواضع اور خود کو پست ظاہر کرنے اور تذلیل یعنی اپنے عجز وشکستگی کا اظہار کہ جس کا نام عبادت وعبودیت ہے وہ خدا کے ساتھ مخصوص ہے کہ جس کی واضح صورت ''سجدہ'' ہے لہٰذا خضوع مطلق اور انتہائی تذلل (مالکیت وربوبیت کے اعتقاد کے بغیر بھی) عبادت ہے اور وہ صرف خدا ہی کے لیے ہے۔اسی بنا پر غیر خدا کو سجدہ کرنا جائز نہیں ہے۔

تفسیر المنار کے مولف نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں عبادت کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

عبادت فقط انتہائی خضوع کا نام نہیں ہے۔بلکہ اس کے ساتھ معبود کی عظمت اس کے تسلط اور کلی احاطہ رکھنے اعتقاد ہونا ضروری ہے وہ تسلط واحاطہ ایسا ہے کہ جس کی اصلیت فہم وادراک سے بلند ہے۔پس یہ ممکن ہے کہ عاشق اپنے معشوق کے سامنے اتنا خضوع کرے کہ اس کا ارادہ وخواہش معشوق کی مرضی میں گم ہوجائے،لیکن پھر بھی اس کو عبادت نہیں کہا جائے گا۔اسی طرح بہت سے افراد کا اپنے حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے انتہائی خضوع بھی عبادت نہیں کہلاتا۔[1]

---

[1] تفسیر المنار جلد ۱ صفحہ ۵۶۔۵۷۔

بزرگ مفسّر علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں مذکورہ بالا کلام کے مشابہ بات کہتے ہیں۔

''عبادت فقط خضوع کا نام نہیں ہے بلکہ بندے کا خود کو اپنے پروردگار کا مملوک قرار دینا عبادت ہے، پھر سورۂ بقرہ میں آدم کو فرشتوں کے سجدے.....کی بحث میں اس قول کا اعادہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''فعل عبادی'' وہ فعل ہے جس میں مولا کی مولویت وحاکمیت اور اپنی عبودیت وبندگی کا اظہار ہوتا ہو۔لہٰذا ان کے نزدیک غیر خدا کے سامنے وہ سجدہ ممنوع ہے جس میں اس کی ربوبیت کا اعتقاد شامل ہو۔پس وہ سجدہ جس میں ربوبیت کا تصور نہ ہو اور صرف احترام کا خیال ہو تو اس میں کوئی مانع نہیں۔لیکن وہ دینی بصیرت اور ذوقِ عبودیت جو دین کے ظاہری احکام کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔اس کا فیصلہ یہ ہے کہ سجدہ خاص خدا ہی کے لیے ہے اور غیر خدا کے سامنے سجدہ نہیں کیا جانا چاہیے [1]

بہرحال اگر لفظ ''عبادت'' کے بارے میں قرآن، سنت، لغت اور روزمرہ کے استعمالات پر باریک بینی سے نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا لغوی مفہوم ''انتہائی خضوع ہے، جس میں معبود کی مالکیت وربوبیت کے اعتقاد کا کوئی دخل نہیں ہے: لہٰذا اگر کوئی فرد پرانے زمانے کے لوگوں کے مجسموں اور بادشاہوں کے سامنے سجدہ کرے تو یہ بھی عبودیت وپرستش ہی ہوگی۔نیز اگر کوئی آئمہ علیہم السلام کی عظمت وبزرگی کے پیشِ نظر ان کو سجدہ کرتا ہے تو اسے پرستش ہی سمجھا جائے گا اور یہ ممنوع ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن سورۂ حٰم سجدہ کی آیت ۳۷ میں سُورج اور چاند کو سجدہ کرنے سے واضح طور پر منع کرتے ہوئے کہتا ہے۔ (لاتسجدوا للشمس ولا للقمر) اور پھر اسی دلیل کے مطابق احادیث وروایات میں بھی بار بار غیر خدا کو سجدہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان میں سے ساٹھ روایتیں وسائل الشیعہ ابوابِ سجود باب ۲۷ میں وارد ہوئی ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ مشرکین سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اخبرونی عنکم اذا عبدتم صورمن کان یعبدوالله فسجد تم لهه او سلیتم ووضعتم الوجوه الکریمة علی التراب بالسجودبها فما الذی بقیتم لرب العالمین؟ اما علمتم ان من حق من یلزم تعظیمهُ و عِبادتُهٗ ان لایساوٰی عبیدُهٗ [2]

یعنی مجھے بتاؤ کہ جب تم خدا کے سامنے عاجز مخلوق کے مجسموں کی پرستش کرتے ہو، ان کی نماز پڑھتے اور ان کو پکارتے ہو، پھر ان کے آگے سجدہ کرنے کے لیے اپنی پیشانی زمین پر رکھتے ہو تو کہو کہ اب رب العالمین کے لیے کیا باقی رہا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ جس کی تعظیم اور عبادت لازم سمجھی جائے، اس کا حق ہے کہ اس کی ناتواں مخلوق کو اس کے برابر نہ سمجھا جائے۔

ایسی بہت سی روایات ہیں جن میں آدم کو فرشتوں کے سجدے اور یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے سجدے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

---

[1] تفسیر المیزان جلد ا صفحہ ۲۲۔۱۲۴۔

[2] وسائل الشعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵، حدیث ۳۔

ان مواقع پر سجدہ خدا ہی کے لیے تھا اور اس میں شکر کا پہلو نمایاں تھا لیکن آدمؑ و یوسفؑ کا احترام بھی پیشِ نظر رکھا گیا[1]

بعض روایات میں ہے کہ آدمؑ و یوسفؑ بہ منزلہ قبلہ کے تھے کہ رُخ ان کی طرف اور سجدہ خدا کی بارگاہ میں تھا[2]

بعض روایتوں میں کہا گیا ہے کہ جب سجدہ خدا کے حکم سے کیا گیا تو اسی کے لیے شمار ہوگا[3]

ان روایات سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیر خدا کو سجدہ نہیں کیا جانا چاہیے.....علاوہ ازیں علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں اس مضمون کی بہت سی روایتیں نقل فرمائی ہیں[4]

مسلمانوں کی ہجرت حبشہ کے مشہور واقعہ میں مذکور ہے کہ جب ان مہاجرین نے نجاشی کے دربار میں حاضری دی تو مسیحی راہبوں نے ان سے کہا کہ تم لوگ بادشاہ کو سجدہ کرو! اس پر جعفر بن ابی طالب نے صاف صاف کہہ دیا۔ لا نسجد الا اللہ یعنی ہم خدا کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔

(۳).....وہابیوں کی شرک آلود توحید:

حجاز کے موجودہ وہابی حکمران محمد بن الوہاب کے پیروکار ہیں کہ جس نے اپنے افکار ونظریات ابنِ تیمیہ، احمد بن عبدالحمید دمشقی (متوفی ۷۲۸ھ) سے اخذ کیے ہیں۔

محمد بن عبدالوہاب نے ۱۱۶۰ھ سے ۱۲۰۶ (اپنے سال وفات تک) کے درمیانی عرصے میں مختلف مقامات کے رئیسوں اور قبائلی سرداروں کے تعاون سے خانہ بدوش عربوں میں تعصبات کی آگ بھڑکائی اور ان کے انبوہ کثیر کی مدد سے اپنے مخالفوں کو زیر کرلیا۔ اس طرح وہ حکومت پر دسترس حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن اس مقام تک پہنچنے کے لیے اس نے حجاز و بیرون حجاز میں ہزاروں مسلمانوں کو بے دریغ قتل کردیا۔

اس شخص کے مرنے کے بعد اس کے پیروکار حجاز سے اُٹھ کر عراق پر چڑھ دوڑے اور کربلا تک جا پہنچے۔ وہ عید غدیر کا دن تھا۔ اس لیے کربلا میں عام تعطیل تھی اور وہاں کے لوگ نجف اشرف گئے ہوئے تھے۔ وہابی آوروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور فصیل توڑ کر اس مقدس شہر میں داخل ہوگئے اور وہاں قتل وغارت کا بازار گرم کردیا۔ انہوں نے پانچ ہزار مومنین کو قتل کیا۔ مرقد حسین سے قیمتی تبرکات اٹھالیے، کھڑکیاں دروازے اکھاڑے اور عام لوگوں کے گھر لوٹتے ہوئے پلٹ گئے۔

پھر ۱۳۳۴ھ کا نا مبارک سال آیا کہ جس میں ان وہابی حکمرانوں نے حجاز میں تمام مزارات مسمار کردیئے جن میں اہل بیتؑ رسولؐ،

---

[1] وسائل الشیعہ جلد صفحہ ۹۸۵، حدیث ۲۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵، حدیث ۷۔

[3] وسائل الشیعہ جلد ۴ صفحہ ۹۸۵، حدیث ۴۔

[4] بحارالانوار۔

اصحاب بنی اور دیگر بزرگان کے مزار شامل ہیں.....انہوں نے صرف بنی اکرمؐ کا روضہ پاک باقی رہنے دیا ہے۔(شاید اسے جمہور مسلمین کے خوف سے مسمار نہیں کر سکے)۔

وہابیوں کی واضح صفات میں تعصّب، تیز مزاجی، سخت دلی، ظاہر بینی اور ضدیت شامل ہے۔لیکن اس کے باوصف وہ خود کو توحید کے محافظ اور موحد خالص قرار دیتے ہیں۔اپنی اس خود ساختہ توحید پرستی کے نتیجے میں وہ شفاعت، زیارت قبور، اور بزرگان اسلام کو وسیلہ، تقرب الٰہی سمجھنے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔لہٰذا مسلمانوں کی بڑی اکثریت یعنی (شیعہ وسنی) ان کے عقائد کی تغلیط کرتے بلکہ کبھی کبھی ان کو کفر سے بھی نسبت دے دیتے ہیں[1]

اس گروہ کے عقائد اعمال پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے، یہاں ہم صرف اتنی ہی گفتگو کریں گے جو توحید عبادت سے تعلق رکھتی ہے۔

وہ کہتے ہیں: کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ وہ پیغمبر اکرمؐ سے طلب شفاعت کرے، کیونکہ خدائے تعالیٰ فرماتا ہے خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو(لاتدعوا مع اللہ أحدًا)

الہدیۃ السنیہ کا (وہابی) مولف لکھتا ہے، جو شخص انبیا اور فرشتوں کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ بنائے وہ کافر ومشرک ہے اور اس کا خون ومال مباح ہے، اگرچہ وہ شہادتین کا قائل اور نماز وروزہ کا پابند ہو[2]

انبیاء ائمہ اور صالحین کا وسیلہ پکڑنے اور ان کے مزارات کی زیارت کے بارے میں بھی وہ ایسا ہی نظریہ رکھتا ہے۔

ان سطح بین وہابی لوگوں سے یہ ایک بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے۔کہ وہ اس دنیا کے موجودات کے اثر وتاثیر کو مستقل سمجھتے ہیں۔اس لیے وہ انہیں خدا کی توحید افعال وتوحید عبادی کے مقابل تصور کر لیتے ہیں۔جب کہ یہ طرز فکر بذاتِ خود شرک کے حکم میں داخل ہے۔

توضیح:

موحدِ کامل کی نظر میں مستقل اور قائم بالذات صرف وجود خدا ہے اور دیگر سبھی موجودات (جو ممکن ہیں) اسی سے وابستہ ہیں جیسے آفتاب کی شعاعیں آفتاب ہی کا وجود ہے۔اور اس سے الگ نہیں ہیں۔کیونکہ ان میں استقلال نہیں یہ اپنے وجود وبقاء میں آفتاب کی محتاج اور اسی سے تعلق رکھتی ہیں۔اسی طرح ہر موجود اور جو کچھ وہ رکھتا ہے یہ اسے خدا ہی سے ملا ہے کہ وہی ذات مسبب الاسباب ہے اور جملہ لاموثر فی

---

[1] مشہور اہل سنت عالم دین احسان عبداللطیف البکری نے ''الوہابیۃ فی نظر علماء المسلمین، کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا ہے جس میں محمد بن عبدالوہاب اور وہابی گروہ کے بارے میں بزرگ علماء کے ارشادات مع حوالہ جات تحریر کیے ہیں کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی ہے جو مختلف علماء نے وہابیوں کے ردّ میں لکھی ہیں اور ان کی تعداد پچاس ہے، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں کو اس فرقے سے بہت زیادہ نفرت ہے۔

[2] الہدیۃ السنیہ صفحہ ٦٦۔

الوجودالا اللہ۔ کے معنی بھی یہی ہیں۔ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اسباب کوسببیت سے الگ کردیں یاان کے استقلال کے قائل ہوجائیں،ان میں سے کوئی صورت بھی درست نہیں ہے۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ جوشفاعت کریں گے وہ خدا کے اذان وجازت سے ہوگی جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ما من شفیع الا من بعداذنہٖ (یونس۔۳)

اسی طرح اگر حضرت عیسیٰ مردوں کوزندہ کرتے ہیں۔ پیدائشی نابیناؤں کو بینائی دیتے ہیں اور لاعلاج بیماروں کوشفاء بخشتے ہیں تو وہ خدا کے اذان وحکم ہی سے یہ کام انجام دیتے ہیں۔یعنی میں خدا کے اذن سے نابینا ؤں کو بینا، برص زدوں کوشفایاب اور مُردوں کو زندہ کرتا ہوں(واُبری الاکمہ والابرص واُحیِ الموتیٰ باذن اللہ)(آل عمران۔۴۹)

پھر اگر حضرت سلیمانؑ کے وزیر آصف بن برخیا کہ جس کے متعلق قرآن کہتا ہے(الذی عندہٗ علمٌ من الکتاب)یعنی وہ شخص جوکتاب میں سے کچھ علم رکھتا ہے،اس کے اندر اتنی قوت ہے کہ بقول قرآن ملکہ سبا کا تخت پلک چھپکنے میں حضرت سلیمان کے سامنے لاحاضر کرے خوداس شخص کے بیان کے مطابق یہ کام من فضل ربی میرے پروردگار کے فضل سے ہوا ہے(نمل ۴۰)

لیکن قرآن سے ناآشناوہابیوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ان بزرگان دین کے یہ افعال مستقل اور ذاتی ہیں۔لہٰذا اس مشکل کوحل کرنے میں انہوں نے بعض ضروریات دین مثلاً شفاعت کا انکار کرنا شروع کردیا۔ یہ بیچارے بزعم خویش پایہ توحید کومستحکم کرنے اور توحید پرستی کی بنیاد واستوار کرنے کی کوشش میں گامے خود ہی شرک کی دلدل میں جا پھنسے اور پھر تعلیم قرآن وضروریات دین سے انکار تک جا پہنچے۔

اس سلسلے میں توحید وشرک کی سرحد، کے عنوان سے استاد مرتضیٰ مطہری شہید نے بڑی مدلل گفتگو فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جیسے ایک طرح کی وحدت وجود کے حامی اس کے قائل ہیں کہ کوئی موجود بالذات وجودِ خدا میں شریک نہیں، کیونکہ تمام موجودات اس کی مخلوق اوراس سے وابستہ ہیں.....ان میں سے کوئی بھی خدا کے مقابلے میں اپنی مستقل حیثیت کا حامل نہیں ہے۔

(۲) مخلوقات کی تاثیر کا اعتقاد اس کی خالقیت میں شرک تصور نہیں کیا جاسکتا (جیس کہ اشاعرہ وجبریہ اس کے قائل ہیں) کیونکہ جس طرح مخلوقات استقلال ذاتی نہیں رکھتے۔اسی طرح وہ تاثیرات میں بھی مستقل نہیں، بلکہ وہ اس ذات مقدس سے وابستہ ہوتے ہیں۔

(۳) اگر ہم مخلوقات کے لیے مستقل تاثیر کے قائل ہوجائیں اور کہیں کہ مخلوقات کا تعلق خدا کے ساتھ ایسا ہے جیسا کہ تعلق ایک مشین یا گھڑی کا اپنے بنانے والے سے ہوتا ہے یعنی یہ چیزیں آغاز میں ایک مانع کی محتاج تھیں،لیکن بعدازاں چاہے وہ مرجائے توبھی وہ اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ یہ وہی نظریہ تفویض اورایک طرح کا شرک ہے(جس پر معتزلہ اعتقاد رکھتے ہیں)

(۴) موجودات کی مافوق الفطرت قوت وقدرت اوراذان الٰہی سے اشیاء عالم میں ان کی تاثیر کا اعتقاد شرک نہیں جیسا کہ وہابی خیال کرتے ہیں۔ بلکہ خود ان کا اعتقاد شرک کی ایک بدترین صورت ہے، کیونکہ اگر ان کی تاثیر کا اعتقاد شرک ہے تو پھر ان کے وجود کو تسلیم کرنا بھی شرک ہوگا۔

(۵) اسی طرح ایک ایسے انسان کی قدرت اور تاثیر کا اعتقاد رکھنا بھی شرک نہیں جو اس دنیا سے جاچکا ہو۔ کیونکہ موت کے بعد انسان جمادات میں شمار نہیں ہوتا، ان سب باتوں کے علاوہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہابیوں کا عقیدہ انسان کی مخالفت کا پہلو بھی رکھتا

ہے وہ اس طرح کہ خدا نے انسان کو فرشتوں سے برتر گردانا کہ وہ خدا کا خلیفہ اور مسجود ملائکہ ہے، لیکن یہ لوگ اسے ایک حیوان کے مقام پر کھینچ لاتے ہیں۔ یہی وہ مرحلہ ہے کہ جب ہم پیغمبر اکرمؐ کی مشہور حدیث کے مفہوم سے آشنائی حاصل کرتے ہیں جس میں آپؐ نے فرمایا: عقائد ونظریات میں شرک اس قدر آہستہ سے اور کسی آہٹ کے بغیر داخل ہوتا ہے۔ جیسے تاریک رات میں ایک چیونٹی کسی سخت پتھر پر چلتی ہے [1]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ وہابی شفاعت اور توسل کی نفی کیلئے جس آیت سے استدلال کرتے ہیں اسی آیت میں ان کے اس ادعاء باطل کا جواب پوشیدہ ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے۔ فلا تدعوا مع اللہ احدًا خدا کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔ (جن۔۱۸) یعنی کسی کو خدا کی مثل اور اس کے مقابل ایک وجود مستقل سمجھ کر نہ پکارو، لیکن اگر کسی کی تاثیر خدا کے اذان اور اس کے فرمان سے ہو تو (اسے پکار) نہ صرف یہ کہ شرک نہیں ہوگا بلکہ یہ توحید کی تائید ہے کہ ہر چیز اصل توحید کی طرف منتہی ہوتی ہے۔

یہ بعینہٖ وہی صورت ہے، جیسے فرزندان یعقوبؑ نے اپنے عظیم باپ کے سامنے ایک تجویز پیش کی تھی، جیسے انہوں نے قبول فرمایا۔ فرزندانِ یعقوب نے کہا: یا ابانا استغفر لنا۔ اے بابا! آپ ہمارے لیے مغفرت طلب کریں (یوسفؑ۔۹۷) حضرت یعقوبؑ نے فرمایا: سوف استغفر لکم ربی۔ عنقریب میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے مغفرت طلب کروں گا۔ (یوسف۔۹۸)

یہ ہے توحید عبادت کی حقیقت نہ وہ کہ جو سطح بین وہابیوں کا نظریہ ہے۔ توحید افعالی کی طرف آئندہ صفحات میں اشارہ ہوگا۔

---

[1] کتاب ''مقدمہ ای بر جہاں بینی، صفحہ ۱۱۳ (تلخیص)

۴۔توحیدافعالی

(۱).....توحیدخالقیت

اشارہ:

''توحیدافعالی'' کاایک سادہ اورروشن مفہوم یہ ہے کہ سارا جہان فعل خدا ہے، ہرفعل ۔حرکت اورتاثیر کی انتہا خداہی کی طرف ہے۔ درحقیقت (لا موثر فی الوجود الا اللہ) خدا کے سوا کوئی موجود مستقل تاثیر نہیں رکھتا۔حتیٰ کہ اگرتلوار کاٹتی ہے آگ جلاتی ہے اور پانی نباتات کواگاتا ہے تو یہ سب کچھ خدا کے ارادے اورحکم ہی سے ہوتا ہے، خلاصہ یہ کہ ہرموجود کااثر تاثیر خدا کی طرف سے ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ تمام موجودات اپنے اصل وجود میں خداسے وابستہ ہیں اوراپنے فعل وتاثیر میں بھی اسی سے تعلق رکھتے ہیں۔

لیکن یہ چیز عالم اسباب اورقانونِ علت کی حاکمیت کی ہرگزنفی نہیں کرتی جیسا کہ امام جعفرصادقؑ سے مروی ایک مشہورحدیث میں ہے(ابی اللہ ان یجری الاشیاء الا باسبابٍ)[1]

خدانے چاہا کہ تمام اموراسباب کے ذریعے انجام پاتے رہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ توحیدافعالی'' کااعتقادکسی بھی صورت میں اصل جبراورانسان کے ارادے کی آزادی کے خلاف نہیں جاتا، خدا نے چاہاتوآئندہ صفحات میں اس پرگفتگوکی جائے گی۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف متوجہ ہوتے اور''توحیدافعالی'' کی اقسام کو محل بحث قراردیتے ہیں،اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم''توحیدِ خالقیت'' سے تعلق رکھنے والی مندرجہ ذیل آیات پرنظرڈالتے ہیں۔

(۱) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۱۰۲ ﴿الأنعام: ۱۰۲﴾

(۲) قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۱۶ ﴿الرعد: ۱۶﴾

(۳) هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۳ ﴿فاطر: ۳﴾

(۴)وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

---

[1] اصول کافی جلد ا باب مغرفتہ الامام.....صفحہ ۱۸۳ حدیث،

لَيَقُولُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝٦١ ﴿العنکبوت: ۶۱﴾

(۵) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝٩٦ ﴿الصافات: ۹۶﴾

(۶) اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۗ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٥٤ ﴿الأعراف: ۵۴﴾ [1]

ترجمہ:

(۱) وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا خالق ہے اسی کی عبادت کرو، وہی ہر شے کا نگہبان ہے۔

(۲) کہہ دو کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ وہ یکتا اور سب پر غالب ہے۔

(۳) کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے؟ وہی تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، پھر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟

(۴) اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور شمس و قمر کو کس نے مسخر کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے، پھر یہ کدھر بہکے جا رہے ہیں؟

(۵) خدا نے تمہیں اور بتوں (کے بنانے میں کام آنے والی چیزوں) کو پیدا کیا۔

(۶) آگاہ ہو کہ خلق اور امر اسی (خدا) کے لیے ہے وہی صاحبِ برکت ہے۔ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

مفردات کی تشریح:

''خلق''، المفردات میں راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ اس کے معنی کس چیز کا صحیح اندازہ کرنا ہے، اب یہ ایجاد و ابداع یعنی اسی چیز بنانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہ ہو۔

مقاییس اللغۃ میں ''خلق'' کے دو معنی درج ہیں (۱) صحیح اندازہ (۲) کسی چیز کا صاف ہونا

---

[1] قرآن میں اس مضمون کی اور آیات بھی ہیں جیسے زمر۔ ۶۲۔ غافر۔ ۶۲۔ ،حشر۔ ۲۴۔ شوریٰ۔ ۲۹، الٓم سجدہ۔ ۷، لقمان۔ ۱۱، روم۔ ۲۲، رعد۔ ۱۶، یونس۔ ۳۴

اسی لیے صاف وشفاف پتھر کو ’’خلقاء‘‘ کہا جاتا ہے اور اندرونی اوصاف کو ’’اخلاق‘‘ کہتے ہیں کہ یہ بھی ایک طرح کی آفرینش ہے، بہرحال اس بناء پر کہ خلقت وآفرینش میں اندازہ کیا جاتا ہے۔اس میں تنظیم وزیبائش بھی ہوتی ہے۔لہٰذا یہ ابداعی خلقت یعنی پہلے سے موجود کسی مثال کے بغیر پیدا کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

وہ عرش کا مالک ہے:

(۱) زیرِ بحث پہلی آیت میں صفات جلال وجمال میں سے بعض کا ذکر کرنے کے بعد خدائے تعالیٰ فرماتا ہے: وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے‘‘ (ذلکم اللہ ربکم) ‘‘یعنی یہ بے حقیقت بُت نیز فرشتے اور جن تمہارے معبود نہیں، کیونکہ یہ خود مخلوق ہیں رزق اور تحفظ کے محتاج ہیں، پروردگار تو صرف خدا ہی ہے [1]

اس کے بعد مزید کہا ہے: اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں (لاالہ الاھو) کیونکہ عبادت وبندگی کیے جانے کے لائق وہی ہے جو سب کا ’’رب‘‘ ہو یعنی تمام اشیاء کا مالک، ان کی پرورش اور تدبیر کرنے والا ہو پھر اس پر تاکید کرنے اور ایک ہی معبود کو ماننے کی دوسری دلیل بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: وہ ہر چیز کا خالق ہے (خالق کل شیءٍ) اور اب نتیجہ کلام کے طور پر کہا کہ جب وہ ان اوصاف کا مالک ہے۔تو ’’اسی کی عبادت کرو‘‘ (فاعبدوئہ)

اس کے ساتھ ہی اس غرض سے کہ غیر خدا سے ہر قسم کی امید کو قطع کرے، افراد انسانی کو عالم اسباب میں دل لگانے سے باز رکھے اور شرک کی جڑوں کو جلا کر راکھ کر دے.....فرماتا ہے۔وہی ہر چیز کا نگہبان ہے (وھو علی کل شیءٍ وکیلٌ)

لفظ ’’شیءٍ‘‘ علماء لغت کے بقول ہر اس چیز کے معنی میں ہے جس سے انسانی علم واطلاع کا تعلق ہوسکتا ہے [2] لیکن آیت زیر بحث میں اس سے خدا کے علاوہ تمام موجودات مراد لی گئی ہے۔بہرحال اس لفظ کا مفہوم بڑی وسعت رکھتا ہے اس میں موجودات مادی ومجرد، ذہنی وخارجی، جوہر وعرض وغیرہ بلکہ خدا کے سوا ہر معلوم ونامعلوم شے شامل ہے، یہ آیت خدا کی خالقیت کے عام ہونے اور اس کے ہر چیز کا خالق ہونے پر ایک واضح وروشن دلیل ہے۔

اس مقام پر ایک مشہور نزاع واختلاف ہے جو لفظ ’’شیء‘‘ میں انسانی اعمال کے شامل ہونے کے خیال سے ایک گروہ میں

---

[1] ذٰلکم اللہ ربکم کا لفظی ترجمہ ہے ’’وہ ہے اللہ تمہارا پروردگار۔لغت عرب میں ذٰلکم اشارہ بعید کے لیے آتا ہے۔ایسے مقامات پر حد سے زیادہ عظمت کا اظہار ہے جو فکر وخیال سے باہر ہے۔

[2] شیء ’’دراصل ’’شاءٍ‘‘ کا مصدر ہے، جو کبھی اسم فاعل (ارادہ کرنے والا) کے معنی میں اور کبھی اسم مفعول (ارادہ شدہ) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے غور کریں۔

پیدا ہوجیسا کہ قائلین جبر میں سے فخر رازی کہتا ہے: ہمارے اعمال بھی لفظ ''شی ء'' میں داخل ہیں، پس ان کا خالق بھی خدا ہی ہے.....وہ اس آیت کوعقیدہ جبر کی دلیل قرار دیتے ہیں لیکن انسان کی آزادی ارادہ کے حامی اس کا واضح اور مدلل جواب دیتے ہیں جس کا ذکر توضیحات میں آئے گا۔

ایک گروہ اس آیت سے اشاعرہ کے مقابل صفات زائد برذات کی نفی پر استدلال کرتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ خدا کی صفات زاید برذات ہیں، حالانکہ اگر یہ صورت ہوتو وہ صفات لفظ ''شی ء'' کے مفہوم میں داخل ہوکر خدا کی مخلوق قرار پاتی ہیں اور یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ خدا اپنی صفات، مثل علم وقدرت کا خالق ہے۔ نیز یہ چیز اس کے واجب الوجود ہونے کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتی۔

اس ضمن میں بعض اشاعرہ کہتے ہیں ہ ہم اس آیت کے عموم کوتخصیص میں بدل سکتے ہیں۔یعنی ہم یوں کہیں کہ ''صفاتِ خدا'' خالق کل شی ء'' میں شامل نہیں ہیں! لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آیت کا طرزِ بیان ہر قسم کے استثناء کی نفی کرتا ہے اور خدا نے چاہا تو ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ آیت زیرِ بحث کے متعلق کوئی تخصیص وارد نہیں ہوئی ہے۔

(۲) دوسری آیت مذکورہ بالا آیت کے مضمون کو خدا کی وحدانیت وقہاریت پر تاکید کا اضافہ کرتے ہوئے بیان کرتی اور کہتی ہے ان مشرکوں سے کہو: جن کوتم خدا کے شریک قرار دیتے ہوکیا انہوں نے خدا کی طرح کوئی چیز پیدا کی ہے؟ ان مخلوقات کے بارے میں وہ دھوکہ کھا گئے ہیں، چونکہ وہ ان کے متعلق ایسا دعویٰ ہرگز نہیں کرتے لہٰذا'' کہہ دو کہ اللہ ہر چیز کا خالق ہے، وہ یکتا اور سب پر غالب ہے''(قل اللہ خالق کل شیء وھو الواحد القھار)۔

''قھار'' کا مادہ ''قہر'' ہے۔اس کے اصلی معنی مدمقابل کی تحقیر کے ساتھ اس پر غلبہ پانا ہے۔اس لیے یہ ان دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ یہاں اس کا صیغہ مبالغہ آیا ہے۔لہٰذا اس کے معنی ہر چیز اور ہر فعل میں بلا قید وشرط مطلق طور پر غلبہ وکامیابی حاصل کرنے کے ہیں۔حتیٰ کہ اس سے مشرکوں کے معبود اور بت بھی مستثنیٰ نہیں ہیں.....پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ خدا کے شریک قرار پاسکیں۔

(۳) تیسری آیت میں ایک بات استفہام انکاری کی صورت میں ذکر ہوئی ہے۔جیسا کہ فرمایا: کیا اللہ کے علاوہ بھی کوئی خالق ہے؟ وہ تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے۔(ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السمآءِ والارض)۔

نہ.....اس کے سوا کوئی خالق نہیں کہ جس نے اولاً تمہیں پیدا کیا اور اَب تمہاری بقاء وحیات کے لیے اس کی طرف سے تمہیں متواتر روزی مل رہی ہے۔وہی ہے جو آسمان سے سُورج کی حیات بخش روشنی، زندہ رکھنے والی بارش اور رُوح پرور ہوا کے جھونکے بھیجتا ہے۔وہی ہے جو زمین سے تمہیں سبز یاں میوے، اناج اور قیمتی معدنی ذخائر عطا فرماتا ہے۔

جب اس کے سوا کوئی خالق ورزاق نہیں اور تمہارا آغاز وانجام اسی کے ہاتھ میں ہے تو اس کے سوا کوئی معبود بھی نہیں ہے۔اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں پھر تم کدھر بہکے جارہے ہو،(لا الہ الا ھو فانی توفکون)

بُت پرست بھی خدا کو خالق جہان مانتے ہیں:

(۴) چوتھی آیت میں ''توحید خالقیت'' کا ایک اور انداز سے ذکر ہوا ہے وہ یوں کہ بت پرست بھی اس بات کے معترف ہیں کہ آسمان وزمین کے خالق بت نہیں بلکہ خدا ہی ان کا خالق ہے۔ارشاد ہوا: اگر آپ ان (مشرکوں) سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا اور شمس وقمر کو کس نے مسخر کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے (ولئن سالتهم من خلق السمٰوٰتِ والارض وسخر الشمس والقمر ليقولن الله)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین اپنے بُتوں کو عبادت یا انسانوں کی تقدیر میں تاثیر رکھنے میں خدا کے شریک وہم پایہ سمجھتے تھے نہ کہ خالقیت میں..... کیونکہ کوئی عاقل انسان ان بتوں کو زمین وآسمان کے خالق نہیں کہتا کہ جو پتھر اور لکڑی سے خود انسانوں نے بنائے اور وہ گویا انسان کی تخلیق ہیں، حتیٰ کہ وہ انبیاء واولیاء کے لیے بھی اس مرتبے کے قائل نہ تھے۔

یہ آیت ضمنی طور پر اس عقیدے کے انسان کی فطرت میں پوشیدہ ہونے کی طرف ایک اشارہ بھی قرار پاسکتی ہے، لیکن توحید خالقیت اور توحید عبادت میں کوئی تناقض نہیں لہٰذا خدا کو خالق ماننا اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک کرلینا بہت بڑی غلطی ہے۔ کیونکہ عبادت کے لائق وہی ہے۔ جو خالق ورازق ہے جس نے آفتاب ومہتاب کو مسخر کیا اور انہیں انسان کا خدمت گذار بنایا، اس لیے خالقیت اور بوبیت میں کوئی جدائی نہیں، نہ ربوبیت اور الوہیت میں کوئی غیریت ہے۔ اس سے واضح تر الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہی خالق وہی مدبر جہان اور وہی بندوں کے لیے عبادت اور پرستش کے لائق ہے۔

بعض مفسرین مثلاً تفسیر ''فی ظلال القرآن'' کے مولف کا خیال ہے کہ مشرکین عرب میں توحید خالقیت کا اعتقاد حضرت ابراہیمؑ جیسے انبیاءؑ کی تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات میں سے تھا[1] لیکن اس بات پر مصر ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ عقل ووجدان کی طرف توجہ کرتے ہوئے ہر انصاف پسند انسان اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اس جہان کو پیدا کرنے والی ایک ہستی لازماً وجود رکھتی ہے جیسا کہ تفسیر روح البیان میں بھی اس طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[2]

بہرحال مسئلہ آفرینش اور تسخیر کا ایک ساتھ ذکر کرنے میں دو چیزیں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے ان میں سے ایک معاملہ خلقت اور دوسرا مسئلہ تدبیر ہے کہ یہ دونوں خدا ہی کے فرمان سے انجام پاتے ہیں۔

اس آیت اور تسخیر سے متعلق دیگر آیات میں ''تسخیر'' سے مراد (آفتاب ومہتاب سے) انسان کے منافع کیلئے کام لینا ہے

''فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ'' کا مادہ ''افک'' بروزن ''فکر'' ہے..... اس کا معنی کسی چیز کو اس کے اصل راستے سے ہٹادینا ہے اس پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ممکن ہے یہ اس چیز کی طرف اشارہ ہو کہ صحیح راستہ یہ ہے کہ خالقیت وتدبیر کا اعتقاد رکھنے کے بعد اس کے سوا کسی کی

---

[1] تفسیر ''فی الطلا القرآن'' جلد ۶ صفحہ ۴۲۸۔

[2] تفسیر روح البیان جلد ۶ صفحہ ۴۸۸

عبادت نہ کی جائے لیکن ان لوگوں نے ٹیڑھا راستہ اختیار کرلیا اور نفسانی وشیطانی خیالوں کے گرداب میں پھنس گئے جس نے انہیں تنکوں کی طرف ادھر سے اُدھر پھینک دیا اور وہ غلط رہوں پر چل پڑے (توجہ رہے کہ مخالف ہواؤں کو مؤتفکات کہا جاتا ہے)

(۵) پانچویں آیت میں بتوں کے مخلوق ہونے کا ذکر ہے جیسا کہ فرمایا: خدا نے تمہیں اور بتوں (کے بنانے میں کام آنے والی چیزوں) کو پیدا کیا (وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ)

یہ اس لئے کہا گیا کہ اس سے پہلی آیت میں توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیمؑ کی زبانی مشرکین سے یوں خطاب ہوا ہے: کیا تم اس چیز کی پرستش کرتے ہو جسے تم نے خود تراشا اور بنایا ہے؟ اس کے بعد آیت زیر بحث میں فرمایا: تم اور تمہارے یہ بت (جو تم نے بنائے) خدا کی مخلوق ہیں، لہٰذا تم مین سے کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں بلکہ یہ بت تو تم سے پست تر ہیں کہ انہیں تم لوگوں نے اپنے ہاتھوں یہ شکل وصورت دی ہے۔

البتہ ان معنوں کے لحاظ سے ''ماتعملون'' میں ''ما'' موصولہ ہوگا لیکن بعض علماء نے یہ احتمال دیا ہے یا ان کا اصرار ہے کہ یہ ''ما'' مصدریہ ہے مگر اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ قرار پائے گا۔ خدا نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا ہے جب کہ یہ مفہوم کئی وجوہ سے مناسب نہیں ہے۔

(۱) اس آیت میں خداوند تعالیٰ مشرکوں کو ان کی بت پرستی پر سرزنش کر رہا ہے۔ اگر خود خدا ہی ان کے اعمال کا خالق ہے تو یہ سرزنش کس بنا پر ہے۔

(۳) آیت ماقبل میں بُتوں کے بارے میں بات ہو رہی ہے کہ وہ انہیں اپنے ہاتھوں تراشتے ہیں'' مناسب یہی ہے کہ اس آیت میں بھی انہیں کا ذکر ہو ورنہ ربط آیات ٹوٹ جائے گا۔ اسی بناء پر بہت سے مفسرین جیسے زمخشری نے کشاف میں، آلوسی نے روح المعانی میں اور علامہ طباطبائی نے المیزان میں تفسیر اوّل ہی کو ترجیح دی ہے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے یہ کیونکر ممکن ہے کہ بت انسان کی صنعت بھی ہوں اور پھر خدا کی مخلوق بھی ہوں زمخشری نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے: بتوں کا مواد خدا کی مخلوق اور ان کی شکل انسان کی صنعت ہے جنہوں نے ان کو تراشا ہے [1]

لیکن بتوں کی صورت وشکل بھی ایک طرح سے خدا کی مخلوق ہے کیونکہ خدا نے ہی انسان کو قوت، علم اور مہارت دی اگرچہ اس نے ان صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھانے سے منع بھی کر رکھا ہے۔

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں ہم توحید خالقیت کا ذکر ایک نئے انداز میں پاتے ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے آگاہ رہو کہ خلق اور امر (تدبیر عالم) اسی (خدا) کے لیے ہے۔ (الالهُ الخلق والامرُ)

وہی صاحب برکت ہے جو عالمین کا پروردگار ہے (تبرك الله رب العلمين)۔

بلاشک یہ آیت ''خلق'' اور ''امر'' کے خدا کی ذات کے لیے حصر وانحصار پر ایک واضح دلیل ہے اس بناء پر یہ آیت بڑی وضاحت کے

---

[1] تفسیر کشاف جلد ۴ صفحہ ۵۱۔

ساتھ ''توحید خالقیت'' کو بیان کررہی ہے[1]

لیکن اس بارے میں کہ ''امر'' سے کیا مراد ہے...... مفسرین کے درمیان بہت زیادہ بحث وگفتگو رہی ہے، ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس سے مراد تدبیر جہان اور وہ نظم وقانون ہے جو یہاں تکوینی طور پر جاری وساری ہے ان کے بیان کا قرینہ وہ کثیر آیات ہیں جن میں یہی بات کہی گئی ہے۔ مثلاً ان فرشتوں کی قسم کہ جو تدبیر امور تدبیر جہان اور وہ نظم وقانون ہے جو یہاں ان فرشتوں کی قسم کہ جو تدبیر امور کرتے ہیں فالمدبراتِ امراً (نازعات، ۵) خدا وہ ہے جس نے دریا کو تمہارے لیے مطیع بنایا تا کہ اس میں اسی کے امر سے کشتیاں حرکت کریں الله الذی سخر لکم البحر التجری الفلك فیه بأمره (جاثیہ ۱۲) ان کے ایسی اور بھی بہت سی آیات ہیں۔

بعض مفسرین نے ''امر'' کو نہی کے مقابل امر تشریعی واحکام الٰہی کے معنی میں تصور کیا ہے، اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوتے ہیں: خلق وآفرینش خدا کے ساتھ مخصوص ہے، اسی کی طرف سے بندوں کے لیے احکام تشریعی صادر ہوتے ہیں، جیسے ایک آیت میں کہا گیا: جو لوگ امرِ خدا کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس سے باز رہیں۔ فلیحذرِ الذین یخالفون عن امرہ (نور، ٦٣)

لفظ ''امر'' کی تیسری تفسیر میں اس سے مراد ''ارادہ'' ہے۔ جیسے خدا جس امر کا ارادہ کرتا ہے وہ پورا ہو جاتا ہے ان الله بالغ امره (طلاق ۳)

چوتھی تفسیر میں عالم ''خلق'' سے عالمِ مادہ اور عالم ''امر'' سے عالم مجردات مراد لیا گیا ہے، اس میں یہ آیت پیش نظر رکھی گئی ہے۔ یہ آپ سے رُوح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہیں کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے ویسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربی۔ (اسراء، ۸۵)

لیکن یہ بات واضح ہے کہ پہلی تفسیر قرآنی آیات اور زیرِ بحث آیت کے مضمون سے بھی مناسبت رکھتی ہے۔ کیونکہ قرآن مشرکین کو باور کرانا چاہتا ہے کہ خلقت وآفرینش اور مخلوقات کی تدبیر خدا کے ساتھ مخصوص ہے، پھر ''رب العالمین'' کا جملہ بھی اس کا شاہد ہے۔

پس بتوں کا نہ خلقت میں اور نہ ہی تدبیر وربوبیت میں کسی طرح کا دخل ہے لہٰذا ان کی پرستش کیوں کرتے ہو؟

توضیحات

(۱) شرک در خالقیت کی طرف پہلا قدم:

ممکن ہے زردشتی وہ پہلے لوگ ہوں جنہوں نے خالقیت میں خدا کا شریک ٹھہرایا، اگر ایسا نہ ہو تو بھی وہی شرک پر اعتقاد رکھنے میں زیادہ مشہور ہیں۔

زردشتیوں نے موجودات کی دو اقسام قرار دیں...... نیک وبد...... (خیر وشر)...... پھر انہوں نے ان دونوں اقسام میں سے ہر ایک

---

[1] خلق وامر پر ''لہ'' کی تقدیم خدا کے لیے ان کے حصر اور غیر سے نفی کی دلیل ہے۔

کے لیے ایک الگ خالق تجویز کیا یعنی ''یزدان واہرمن، یا ''نور وظلمت'' اس کے لیے ان کی دلیل یہ ہے کہ خالق اور مخلوق میں مناسبت ہونا چاہیے اور ''خیر'' کے خالق کی ''شر'' سے کوئی نسبت نہیں لہٰذا ''خیر'' کا خدا ''خیر'' اور ''شر'' کا خدا ''شر'' کا حامل ہے۔[1]

بہرحال اگر موجودات جہان میں یہ گروہ بندی موجود ہوتی ہے تو ممکن ہے ان کا یہ استدلال صحیح قرار پاتا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس جہان میں ''خیر'' کے علاوہ کوئی چیز وجود نہیں رکھتی جس چیز کو ''شر'' کا نام دیا جاتا ہے وہ یا تو عدمی ہے یا نسبتی پہلو سے شر کہلاتی ہے۔مثلاً ہم کہتے ہیں کہ ''فقیر'' شر ہے، جب کہ فقر ضروریات زندگی سے تہی دامن ہونے کے سوا کچھ نہیں، یہ ناداری ایک امر عدمی ہے اور عدم ایک ایسی چیز ہے، کہ اس کا کوئی آفریدگار نہیں ہے۔

یا یوں سمجھ لیں کہ ہم شہد کی مکھی کے ''ڈنک'' اور درندے کے ''نیچے'' کو شر کہہ دیں جب کہ ہم خود کو مرکز ومحور تصور کرتے ہوئے اس طرح کا فیصلہ دیتے ہیں۔لیکن اگر ہم شہد کی مکھی کی طرف توجہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ڈنک اپنے دشمن سے دفاع کے لیے اس کی اہم ضرورت ہے اسی طرح درندے کا پنجہ اس کے لیے شکار کرنے اور اپنی خوراک بہم پہچانے کا وسیلہ ہے۔لہٰذا یہ چیزیں ان کے لیے ''خیر'' کا پہلو رکھتی ہیں۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے موجودات ہیں جن کو ہم اپنے حسابوں ''شر'' کہتے ہیں لیکن ان کی اصلیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔

کبھی ہماری جہالت اور بے علمی اس کا سبب بنتی ہے کہ ہم بعض چیزوں کو برا (شر) سمجھ لیتے ہیں۔

مثلاً ممکن ہے کہ ہم میکروب (جراثیم) کے وجود کو شر سمجھیں کہ وہ بیماری پیدا کرتے ہیں۔لیکن اگر ہم بعض ماہرین کے نظریئے پر توجہ کریں کہ میکروب انسانی بدن کے سلول (خلیوں) کو ہمیشہ مقابلے پر اکساتے ہیں جس سے ان میں زیادہ سے زیادہ طاقت اور فعالیت پیدا ہوتی ہے۔اگر یہ میکروب نہ ہوں تو شاید ایک انسان کا وجود اسی (۸۰) سال سے اوپر زندہ نہ رہتا اور اس زندگی میں بھی وہ کمزور وناتواں ہوتا، اس لحاظ سے ہم مانتے ہیں کہ ہمارا ان میکروب کو شر (برا) سمجھنا خود ہماری ہی نادانی کا نتیجہ ہے اور وہ حیات انسانی کے لیے مفید اور نافع ہیں۔

یاد رہے کہ جس خالق نے ان میکروب کو پیدا کیا، جب وہ حد سے بڑھ جائیں تو ان سے مقابلہ کرنے اور انہیں زیر کرنے کا سامان بھی کر دیا ہے۔چنانچہ انسان کے جسم میں ایسے خیلے موجود ہیں جو ان کا سامنا کرتے ہیں۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہے آج کے دور میں حیوانات کے زہر سے کئی ایک شفا بخش دوائیں تیار کی جارہی ہیں اسی لیے قسم قسم کے سانپ اور دوسرے زہریلے جاندار اپنے اندر زہر کی تیاری اور حفاظت کرتے ہیں۔پس ایسے جانداروں کے ڈنک اور ان میں پائے جانے والے زہر مطلق طور پر بُرے (شر) نہیں ہیں اس موضوع کے بارے میں مزید وضاحت انشاءاللہ عدلِ الٰہی کی بحث کے ضمن میں کی جائے گی۔

(۲) راہِ شرک میں دوسرا قدم:

مسئلہ شرک میں مسلمانوں کے دو گروہ صحیح راستے سے بھٹک گئے وہ شاعرہ اور معتزلہ (مفوضہ) ہیں۔

---

[1] بعض کے نزدیک یہ عقیدہ مزدک اور اس کے پیروکاروں کا ہے لہٰذا وہ زردشت کو موحد سمجھتے ہیں۔

اشاعرہ:

اشاعرہ، ابوالحسن اشعری (متوفی ۳۲۴ھ) کے پیروکار ہیں، یہ لوگ عالمِ خلقت میں علت ومعلول اور ہر قسم کی تاثیر کے منکر ہیں وہ کہتے ہیں: اگر آگ کسی چیز کو جلا رہی ہے تو یہ محض ایک مفروضہ ہے اور دراصل جلانے والا خدا ہے، لیکن خدا کا ارادہ یہ ہے کہ آگ اس وقت جلائے گی جب انسان کا ہاتھ اس سے مس کرے خدا ہی نے اس کے ہاتھ کے لیے جلنا مقرر کیا ہے۔ اس طرح انہوں نے اس جہان میں علت ومعلول کے وجود سے انکار کیا ہے، ان کے نزدیک بلا وسطہ اور براہ راست سب کاموں کی علت صرف خدا ہی ہے۔

انہوں نے ایک محسوس بلکہ محسوس سے بھی بالاتر چیز کا انکار کر دیا۔ ان کا خیال ہے کہ اگر ہم عالم اسباب کا اعتقاد کر لیں تو ''توحید خالقیت'' اُلٹ پلٹ ہو کر رہ جائے گی[1]

اشاعرہ اس بہت بڑی غلط فہمی کے باعث ایک زبردست انحراف میں گرفتار ہو گئے وہ یہ کہ انہوں نے انسان کے اعمال وافعال کو بھی خدا کی مخلوق سمجھ لیا اور یہ خبر کی بدترین قسم ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات جبر سے بھی کچھ بڑھ کر رہے کہ وہ کہتے ہیں: یہ ہم نہیں ہیں جو اچھے برے اعمال انجام دے رہے ہیں، بلکہ ان کا خالق خود خدا ہی ہے، اصل میں یہ براہ راست اسی کے اعمال ہیں اور یہ ہمارے جبری اعمال نہیں ہیں۔ (غور کریں)

معتزلہ:

اشاعرہ کا نقطہ مقابل معتزلہ ہیں، ان کا نظریہ ہے کہ اس جہان میں اسباب وعلل ہیں اور یہ اپنی تاثیر میں مستقل ہیں۔ مثلاً وہ معتقد ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے بعض انبیاء اور اولیاء کو پیدا کیا اور پھر امرِ خلقت ان کے سپرد کر دیا نیز وہ انسان کو اپنے اعمال میں کلی طور پر مختار ومستقل جانتے ہیں۔ اس طرح وہ انسان کو خالق اصغر اور خدا کو خالق اکبر تصور کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں گروہ غلط فہمی میں پڑ گئے اور دونوں ہی ایک طرح سے شرک میں مبتلا ہوئے ہیں، ان میں سے ایک گروہ شرک جلی میں اور دوسرا شرک خفی میں گرفتار ہے۔

چنانچہ معتزلہ جو ''تفویض'' کے قائل ہیں وہ شرک جلی میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اعمال میں انسان کے مستقل ومختار کل ہونے کے معتقد ہیں یا وہ اس چیز پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے زمین وآسمان کی خلقت وآفرینش اپنے اولیاء کے سپرد کر دی اور خود ایک طرف ہو بیٹھا ہے۔ یہ نظریہ اور یہ تصور صریحاً قرآنی آیات کے خلاف ہے کیونکہ قرآن پکار پکار کہہ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا شرکت غیرے اس کائنات کا خالق اور مدبر ہے۔ یہ بڑی تعجب کی بات کہ کوئی شخص قرآن پر ایمان رکھتا ہو اور پھر اسی لایعنی گفتگو کرے۔

---

[1] قانون علت صرف حسی چیز نہیں ہے بلکہ وجدان اور علم حضوری سے بھی اس تک رسائی ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص واضح طور پر دیکھتا ہے کہ اس کی روح ایک ارادہ اور تفکر پیدا کرتی ہے۔

اسی طرح اشاعرہ کا گروہ بھی شرک کی ایک اور قسم کا مرتکب ہوا ہے کیونکہ اولاً دنیا میں اصل علیت کے وجود سے انکار وجدان وحسن کے برخلاف ہے ثانیاً اگر اصل علیت کو ماننا شرک ہے تو پھر وجود انسان کو ایک اصل کے طور پر تسلیم کرنا بھی شرک ہوگا۔

انسان اپنے اعمال وافعال کی انجام دہی میں مختار اور آزاد ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس کی قوت وطاقت یہاں تک کہ اس کے ارادے کی آزادی بھی خدا کی عطا کردہ ہے وہی ہے جو چاہتا ہے کہ انسان آزاد ہو۔اس لیے انسانی اعمال جو انسان ہی کے ہیں، ان کی خدا کی طرف نسبت دی جاسکتی ہے اور وہ اس کے دائرہ خلقت سے خارج نہیں ہیں، جیسے یہ اعتقاد کہ وجود انسان اسی سے وابستہ ہے اور یہ شرک نہیں۔

ایک مثال پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ بہت سی گاڑیاں بجلی سے چلتی ہیں جس کے تار پٹڑی کے ساتھ ساتھ اُوپر تنے ہوتے ہیں، ان تاروں سے انجن کا رابطہ ایک آہنی حلقے کے ذریعے قائم رہتا ہے گاڑی چلانے والا (ڈرائیور) اپنے عمل میں آزاد ہے کہ اپنی مرضی سے گاڑی کو چلاتا اور ٹھہراتا ہے لیکن اس سارے عمل کی مرکزی قوت کسی اور کے ہاتھ میں ہے کہ جس کو بجلی کے تاروں کے اس سارے سلسلے پر قابو حاصل ہے اور وہ جب چاہے ایک بٹن دبا کر گاڑی کو روک دے۔لہٰذا وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے کہ گاڑی کی حرکت میرے بس میں ہے اور گاڑی کا ڈرائیور بھی یہ بات کہنے کا حق دار ہے کہ گاڑی کا چلنا اور ٹھہرنا میرے ہاتھ میں ہے۔درحقیقت وہ دونوں ہی سچ کہہ رہے ہیں کیونکہ وہ دونوں گاڑی چلانے ٹھہرانے کے فعل کے فاعل ہیں لیکن ان کا فعل ایک دوسرے کے طول میں یعنی یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتا ہے نہ کہ ایک دوسرے کے مقابل۔

ایک پہلے مرحلے میں گاڑی چلانے کے فعل کا فاعل ہے اور وہ بلند وبالا ہے۔

دوسرا مرحلہ دوم میں اس فعل کا فاعل ہے جو پہلے کے ساتھ وابستہ اور اس سے پست ہے۔

گاڑی کو چلانے اور روکنے کے عمل کی نسبت دونوں کی طرف ہے۔لیکن اس کے باوجود ڈرائیور اپنے کام میں آزاد اور جواب وہ ہے نہ کہ مجبور..... بناء بریں انسان کے اپنے ارادے میں آزاد ہونے کا اعتقاد خدا کی خالقیت میں شرک متصور نہیں ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر اصل وجود انسان جو خدا سے وابستہ ہے اور اس کو تسلیم کرنا موجب شرک نہیں تو انسان کے افعال کو اس سے نسبت دینا بھی شرک قرار نہیں پاتا۔

اشاعرہ وجودِ انسان کو مستقل سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، لیکن اگر ایک وجود وابستہ توحید میں مزاحم نہیں تو اس کے افعال بھی توحید میں کوئی نقص پیدا نہیں کرتے۔

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ایک اور مثال سے اس بحث کو کچھ اور بھی واضح کر دیا جائے۔

اشاعرہ کی طرف سے اصل علیت وسببیت کا انکار اس گمان کی بناء پر ہے۔ یہ شرک شمار ہوتا ہے یعنی اگر جلانے کے عمل کو آگ کی طرف نسبت دیں تو بقول ان کے یہ شرک ہے، جب کہ یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ آیا خدا کے مقابل آگ کے اصل وجود کا قائل ہونا شرک نہیں ہے؟ اس کے جواب میں وہ لازماً یہ کہیں گے۔

کہ آگ کا وجود ذاتِ خداوندی سے وابستہ ہے۔لہٰذا آگ کے وجود کو تسلیم کرنا شرک نہیں ہے (جیسا کہ وہ روشنی جو قمقمے سے مرتعش ہوتی ہے وہ اس قمقمے کے بجلی گھر سے رابطے کی بدولت اسی سے وابستہ ہے اور جب یہ رابطہ منقطع ہوجائے تو وہ روشنی ناپید ہوجاتی ہے)۔

بعینہٖ یہی بات ہم اس دنیا میں اسباب وعلل کی تاثیر کے بارے میں کہتے ہیں کہ آخرش وہ خدا کے وجود سے وابستہ ہیں، انسان کی قوت واختیار بھی اسی ذات سے وابستہ ہے۔ بہ ایں طوران تمام موارد میں توحید ثابت ومحفوظ رہے گی، گویا ہر چیز کا خالق خدا ہے۔ اصل علیت اور انسان کی آزادی ارادہ کو تسلیم کرنے سے اس کی خالقیت ووحدانیت میں کوئی خلل نہیں آتا۔

جبر واختیار کی بحث میں انشاءاللہ اس موضوع سے متعلق مزید تشریحات سپردِ قلم کی جائیں گی۔

(۲) توحید ربوبیت

اشارہ:

توحید ربوبیت کے معنی یہ ہیں کہ اس عالم ہستی کا منصوبہ ساز، اس کا نظام قائم کرنے والا اور اسے چلانے والا صرف خدائے واحد ہے۔

لفظ ''رب'' کہ خدا کے صفات میں سے ایک ہے اور فارسی میں اس کا بدل ''پروردگار'' آتا ہے۔ شاید یہ تمام اوصاف خداوندی میں سے قرآن میں سب سے زیادہ دوہرایا گیا ہے۔ (یعنی رب، ربك، ربكم، ربنا، اور ربی کی صورت نو سے زیادہ مرتبہ قرآن میں مذکور ہے)۔

بہت سی آیات قرآن میں خداوند تعالیٰ کو ''رب العالمین'' (اہل جہان کو پالنے والے) کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن مسئلہ توحید ربوبیت پر خاص طور پر توجہ دیتا ہے، کیونکہ مشرکین ایسے لوگ تھے جو تدبیر جہاں (دنیا کا نظام چلانے) میں بعض موجودات کو خدا کے ساتھ شریک اور ساجھی قرار دیتے تھے۔ چونکہ اکثر مشرکین جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ توحیدِ خالقیت پر یقین رکھتے تھے، لیکن توحید ربوبیت کے ضمن میں شرک کے مرتکب ہو رہے تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن عقیدے کی اس غلطی اور اس بہت بڑی گمراہی کی بار بار تردید کرتا ہے۔ جو مختلف اقوام میں موجود رہی ہے، نیز یہ کہ شرک وروبیت بجائے خود بہت سی گمراہیوں اور بے لگامیوں کا سرچشمہ ہے جن کے بارے میں آئندہ مباحث میں گفتگو کی جائے گی۔

اس اشارے کے ساتھ ہی ہم توحید روبیت سے متعلق آیات قرآن میں سے درج ذیل آیتوں پر توجہ دیتے ہیں۔

(۱) اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (فاتحہ [1] ۔۱)

(۲) قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ﴿الأنعام: ۱۶۴﴾

(۳) قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلِ اللّٰهُ ﴿رعد: ۱۶﴾

(۴) فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ۱۱۶ ﴿المؤمنون: ۱۱۶﴾

---

[1] رب العالمین'' کی ترکیب آیاتِ قرآن میں کچھ اوپر چالیس بار آئی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے مسئلہ توحید ربوبیت کی وضاحت اور تشریح پر بہت زیادہ توجہ دی ہے جس سے اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

(۵) اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۱۲۶ ﴿الصافات: ۱۲۶﴾

(۶) قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ؕ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۳۱ ﴿یونس: ۳۱﴾

ترجمہ:

(۱) تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں جو تمام اہل جہان کا پالنے والا ہے۔

(۲) کہو کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی پروردگار ڈھونڈوں، جب کہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔

(۳) کہو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہو کہ اللہ!

(۴) پس برتر ہے وہ خدا جو بادشاہ حق ہے (اس سے بالاتر ہے کہ تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہو) اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی عرشِ کریم کا پروردگار ہے۔

(۵) وہی اللہ تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پروردگار ہے۔

(۶) کہو کہ کون تمہیں آسمان وزمین سے روزی دیتا ہے؟ کون کان آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے؟ کون زندہ کو مردہ میں سے، اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا ہے؟ زندہ کو مردہ میں سے، اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا؟ کون امور عالم کی تدبیر کرتا ہے؟ فوراً وہ (تمہارے جواب میں) کہیں گے.....اللہ.....کہو کہ پھر کیوں تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟ (کیوں خدا سے نہیں ڈرتے اور راہ شرک پر چلتے ہو)۔

مفردات کی تشریح:

''رب'' یہ ایک بنیادی لفظ ہے، اس کی شاخیں اور مواردواستعمال بہت زیادہ ہیں۔ یہ ایک اساسی و بنیادی لفظ اس اس طرح ہے کہ المفرادات میں راغب اصفہانی کہتا ہے: اس کے معنی تربیت دینا اور کسی چیز کو کمال کی راہ پر ڈالنا ہیں۔

مقاییس اللغۃ میں اس کے چند ایک اساسی معنی بیان ہوئے ہیں۔

(۱) وہ شخص جو کسی چیز کی اصلاح کرے اور اس عمل پر قائم رہے۔

(۲) جو کسی چیز کو لازم کرے اور اسے قائم رکھے۔

(۳) دو چیزوں کو آپس میں ملانا۔

لیکن جیسا کہ ''التحقیق فی کلمات القرآن الکریم'' میں کہا گیا ہے کہ ان سب معانی کی بازگشت ایک اصل کی طرف ہے جس کی تعبیر کچھ یوں ہے: رب ور بوبیت سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کو مختلف جہات مثلاً مادی ومعنوی ذاتی وعرضی، نیز اعتقاد، صفات اور اخلاق میں کمال حاصل کرنے اور نقائص دور کرنے کے راستے پر لگانا اور اس میں اس کی نصرت کرنا۔

چونکہ ایسے عظیم کام کے لیے اقدام کرنے میں دیگر مفاہیم، جیسے اصلاح، تدبیر، حکومت مالکیت مصاحبت، سیادت، اجتماع، تعلیم اور تغذیہ بھی شامل ہیں، اس لیے ان معانی میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کتب لغت میں اس کے متعدد معانی ذکر ہوئے ہیں، مثلاً لسان العرب میں ہے۔ کہ لفظ ''رب'' کا اطلاق خداوند کریم کی ذاتِ پاک پر کیے جانے کے علاوہ اسے مالک وقاء مدیر، مربی، قیم اور منعم کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے یہ اصل میں اس کے معنی وہی پرورش، تربیت اور کمال کی طرف لے جانا ہیں پھر ان کے ساتھ لزوم رکھنے والے ہر امر پر اس کا اطلاق ہونے لگا، اسی بنا پر لفظ ''رب'' کے فارسی ترجمہ میں اسے ''پروردگار'' سے تعبیر کیا جاتا جو ان تمام معانی کا جامع ہے [۱]

بہرحال علماء لُغت کے اقوال سے اس کا جو مفہوم سمجھ آتا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ ''رب'' مفرد طور پر صرف ذات الٰہی کیلئے بولا جاتا کیونکہ وہی تمام چیزوں کا مالکِ حقیقی، دلی اور مصلح ہے لیکن جب یہ غیر خدا کے لیے استعمال ہو تو یہ کسی اور کلمہ کی طرف مضاف ہوگا، جیسے ''رب الدار'' (گھر کا مالک) ''رب الابل'' (اُونٹ کا مالک) اور ''رب الصبی'' (بچے کی پرورش وتربیت کرنے والا)'' [۲]

جب لفظ ''رب'' خدائے تعالیٰ کے لیے استعمال کیا جائے تو ممکن ہے کہ یہ ربوبیت کے مختلف جہات کو ظاہر کر رہا ہو۔ جیسے مالکیت، تدبیر، اصلاح اور سرپرستی وعطائے نعمت وغیرہ (غور کریں)۔

''تدبیر'' اس کا مادہ ''دبر'' بروزن ''ابر'' ہے جس کا معنی کسی چیز کے بعد یا پیچھے آنا ہے، تدبیر سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کا انجام خوب ہو اور وہ مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کے قابل بن جائے..... یہ کام علم وآگاہی کے بغیر نہیں کیا جاسکتا، اس لیے ''مدبر'' ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو مختلف کاموں کے نتیجے پر نظر رکھیں، ان کو مطلوبہ مقاصد تک پہنچائیں اور اس بارے میں ضروری علم وآگاہی رکھتے ہوں [۳]

---

[۱] یاد رہے کہ رب کا مادہ ''دبب'' ہے جیسے تربیت کا مادہ ''ربو'' ہے لغت میں ''رب'' کے جو معنی دیئے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''رب ور بو'' ایک ہی معنی رکھتے ہیں، علامہ طبرسیؒ نے مجمع البیان جلد ۱ صفحہ ۳۲ میں ان دونوں لفظوں کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔

[۲] لسان العرب، مفرداتِ راغب اور قاموس اللغۃ میں مادۂ ''رب'' کے ذیل میں دیکھیں۔

[۳] ملاحظہ فرمائیں۔ مقاییس اللغۃ، مفرداتِ راغب، اور التحقیق فی کلمات القرآن الکریم۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

اے خدا.....تو سارے جہان کا پروردگار ہے

(۱) پہلی آیت جسے ہم اپنی نمازوں میں دوہراتے ہیں اس میں کہا گیا ہے تمام تعریفیں خدا کیلئے ہیں جو تمام اہل جہاں کا پالنے والا ہے۔ (الحمدللہ رب العلمین)

یہ جملہ اسی صورت میں قرآن کی متعدد آیات میں بندوں کی طرف سے اور خدا کی طرف سے بار ہا دہرایا گیا ہے، ان مواقع پر کبھی اس کا تعلق دنیا سے ہے اور کبھی قیامت سے مربوط ہے۔[1]

درحقیقت یہ آیت اپنے اندر ایک پر معنی استدلال لیے ہوئے ہے اور وہ یہ کہ خدائے بزرگ وبرتر ہر طرح حمد، ستائش اور تعریف کے لائق ہے کیونکہ وہ اہل جہاں کا حقیقی وواقعی مربی وسرپرست ہے۔ وہ ان کا خالق بھی ہے اور رازق بھی، ان کا مالک بھی ہے اور کمال کی طرف لے جانے والا بھی، وہ ان کے کام بنانے والا ہے بھی ہے۔ اور ان کو نیک وبد سمجھانے والا بھی وہ ان کا معلم بھی ہے اور ہادی بھی۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ''الحمد'' جب جنس کی صورت میں آئے تو اس میں تمام اقسام کی تعریفیں اور ستائشیں شامل ہوجاتی ہیں، اسی طرح العالمین'' جب الف لام کے ساتھ جمع کی صورت میں آئے تو یہ تمام موجودات عاقل وغیر عاقل مادی ومجرد کو شامل ہوتا ہے۔ اس کے صیغہ جمع عاقل آنے کی وجہ مخلوق عاقل کی تغلیب وکثرت ہے[2])

بنابریں اگر اس دُنیا میں کچھ لوگ تعلیم وتربیت اور رزق ونعمت دے رہے ہیں تو یہ اس خدائے واحد کی ربوبیت ہی کا پرتو ہے اگر کوئی شخص مالکیت رکھتا ہے تو یہ اسی کی مالکیت مطلقہ کی ایک شعاع ہے لہٰذا قبل اس کے کہ ہم اس کے بندوں کے احسان پر ان کا شکریہ ادا کریں اور ان کی تعریف کریں، ہمیں خدا کی ذات مقدس کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

چونکہ ''حمد وسپاس'' اس کی طرف سے عطاء ہونے والی نعمتوں پر ہے لہذا فخر رازی نے اس مقام پر خداوند تعالیٰ کی نعمتوں کا اجمالی تذکرہ کیا ہے وہ کہتا ہے، اگر صرف انسانی بدن پر بغور نظر ڈالی جائے تو بقول ماہرین علم الاعضاء اس میں قریباً پانچ ہزار مختلف اعضاء اور طرح طرح کی مفید وامنافع بخش رگیں اور نسیں ہیں جو خدا نے اپنے کرم سے ہمیں عنایت فرمائی ہیں نیز یہ کہ ان میں سے جو چیزیں معلوم ہوچکی ہیں۔ وہ ان کے مقابل بہت کم ہیں جو ابھی دریافت نہیں ہوئی ہیں بلکہ معلوم رگ وپے نامعلوم چیزوں کے سامنے سمندر

---

[1] سورۂ انعام: ۱ سورۂ یونس۔ ۱۰ سورۂ صافات۔ ۱۸۲ سورہ زمر۔ ۷۵ سورۂ مومن۔ ۶۵۔

[2] یہی وجہ ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے سامنے خداوند تعالیٰ کو رب العالمین، کی صفت کے ساتھ یاد کیا تو اس نے پوچھا رب العالمین کون ہے؟ حضرت موسیٰ نے جواب دیا: رب السمٰوٰت والارض وما بینھما یعنی رب العالمین وہ ہے جو آسمانوں وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ان سب کا پروردگار ہے۔

میں سے ایک قطرہ کی مانند ہیں۔

پھر وہ خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کے آثار اور جہان ہستی میں اس کی تدبیر وحکمت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے: ان چیزوں پر توجہ دی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس دُنیا کی تمام چیزوں کو انسان کے اختیار میں دے رکھا ہے، لیکن وہ تا حال ان میں سے بہت کم چیزوں کی حقیقت تک پہنچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''الحمدللہ'' کا جملہ ان تمام منکشف وغیر منکشف حقائق ومسائل کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔[1]

البتہ فخر رازی نے اپنے زمانے کے علوم کے لحاظ سے بات کی ہے۔ لیکن ہمارے زمانے تک مختلف علوم نے جو ترقی کی اور جو دریا فتیں ہو چکی ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو اس نے جو اعداد وشمار دیئے ہیں وہ بہت کم بلکہ صفر کے برابر ہیں۔ کیونکہ صرف انسان کے بدن میں ایک کھرب سلول اور خلیے وجود رکھتے ہیں، جو انسان کی بقاء کے لیے مصروفِ کار اور پروردگار کی ربوبیت سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ خدا کی اس نعمت پر شکر ادا کرنا لازم ہے۔ اگر انسان اپنے بدن میں پائے جانے والے ان خلیوں کو شمار کرنا چاہے اور شب وروز اس کا کام میں لگا رہے تو تین لاکھ سال درکار ہوں گے۔ پھر وہ خدا کے شکر کا حق کس طرح ادا کر سکتا ہے۔؟ یعنی انسان خدا کی نعمتوں پر جتنا بھی شکر ادا کرے وہ کم تر ہی ہوگا۔

(۳) دوسری آیت کہ جس میں رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف ہے۔ اس میں فرماتا ہے (اے پیغمبرؐ! ان مشرکوں سے) کہو کہ کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی پروردگار ڈھونڈوں جب کہ وہ ہر چیز کا پروردگار ہے۔ (وقل اغیر اللہ ابغی ربا وھو رب کل شیء)۔

تم خود کو دنیا کے کلی وعمومی نظام آفرینش سے کیونکر الگ رکھنا چاہتے ہو، جب کہ خدائے واحد تمام موجودات عالم کا پروردگار ہے پھر کیوں نہ ہم اسے اپنا ''رب'' سمجھیں؟ آیا یہ ممکن ہے کوئی دوسری چیز جو خود ہی اس کی ربوبیت کے تحت ہو ہم اسے خدا کے ساتھ شریک کریں اور جو مربوب ہے اسے رب مانیں، مخلوق کو خالق کے برابر لائیں اور بندے کو مولا کا ہمسر بنا دیں؟ یہ کیا فیصلہ ہے جو تم کرتے ہو؟

اگر لفظ ''شیء'' کے مفہوم کی وسعت کی وسعت پر توجہ کی جائے کہ جو تمام ''ماسوی اللہ'' (خدا کے سوا سب چیزوں) کو شامل ہے تو اس آیت میں توحیدِ ربوبیت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں آیت ہذا سے پہلی دو آیتوں میں نبی کریمؐ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ مشرکین سے صاف کہہ دیں: میری نماز اور دیگر عبادات میری زندگی اور میری موت سب کچھ اس خدا کے لیے ہے جو سب اہل جہان کا پروردگار ہے۔ (قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العلمین)۔

میں غیر خدا کی پرستش کیوں کروں؟ سوائے خدا کے کسی آستان پر کیوں سجدہ کروں؟ اس کے غیر کی یاد کے لیے کیوں زندہ رہوں؟ اس کے غیر کے لیے کیوں اپنی جان دُوں؟ حالانکہ میرا خالق، مالک، مربی اور پالنے والا صرف وہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں توحید عبادت

---

[1] تفسیر فخری رازی جلد ۱ صفحہ ۶۔

اورتوحید ربوبیت باہم جڑی ملی ہوئی ہیں اور ایک روحانی مرکب کا نمونہ پیش کررہی ہیں[1]

(۳) تیسری آیت میں بھی پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہے اور نتیجہ کلام کے طور پر زمین وآسمان کے پروردگار کا ذکر ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ ''رب العالمین'' اور ''رب کل شیءٍ'' میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے اگر الفاظ مختلف ہیں، جیسا کہ فرمایا: (مشرکوں سے) کہو کہ آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ (قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ)

چونکہ مشرکین یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ یہ بت یا انسانوں میں سے بنے ہوئے معبود اور ایسے ہی دیگر موجودات زمین وآسمان کی تدبیر کرنے والے، ان کو قائم رکھنے والے اور ان کا نظام برقرار رکھنے والے ہیں، لہٰذا بلا فاصلہ نبی اکرمؐ کو حکم دیا ہے کہ آپ خود ہی اس سوال کو جواب دیں، جیسا کہ فرمایا: کہو کہ اللہ (ہی زمین وآسمان کا پروردگار ہے) قُلِ اللّٰهُ۔

اب جو بھی اس کا غیر ہے۔ اس کو الوداع کہہ دو، اس کے سوا جو بھی ہے اس سے دل کو ہٹالو اور صرف اسی کی ذات پاک پر تکیہ کرو، اپنا دل اس کے حوالے کردو اور اپنی پیشانی اس کے آستان پر رکھو۔ تمہیں ان موجودات (بتوں) سے کیا سروکار کہ جو اپنے سود وزیاں کے بھی مالک نہیں پھر وہ دوسروں کے کیا کام آئیں گے (لَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا فرقان۔ ۳)

(۴) چوتھی آیت میں عرش کے بارے میں خدا کی ربوبیت کا ذکر ہے، لیکن اس کا آغاز اس کی ''حاکمیت'' کے بیان سے ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہورہا ہے۔ پس برتر ہے وہ خدا جو بادشاہ حق ہے (اس سے بالاتر ہے کہ تمہیں بے مقصد پیدا کیا ہو (فتعالیٰ اللّٰه الملك الحق)۔

یہ جملہ تکمیل طور پر آیا ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلی آیت میں کہا ہے: اگر معاد وقیامت مقرر نہ ہو تو انسان کی خلقت و پیدائش بے معنی ہوجائے گی۔ کیونکہ دنیا کی یہ چندروزہ زندگی کوئی اتنا بڑا مقصد نہیں کہ آفرینش و پیدائش کا سب قرار پائے (یہ معاد قیامت کے بارے میں ایک اہم دلیل ہے، انشاء اللہ بحث قیامت میں اس پر مفصل گفتگو کی جائے گی)۔

پھر اس پر اضافہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی عرش کریم پروردگار ہے (لا اله الا هو رب العرش الكريم)۔

''ملک'' حاکم اور مالک کے معنی میں ہے اور یہ وصف خداوند تعالیٰ کے علاوہ کسی اور پر صادق نہیں آتا، کیونکہ یہ خالقیت کی ایک شان اور اس کے لوازم میں سے ہے۔ چونکہ اس کے سوا کوئی خالق وجود نہیں رکھتا۔ لہٰذا کوئی مالک اور حاکم بھی نہیں ہے۔ اسی لیے بعد ازاں اسے ''حق'' سے متصف کیا اور پھر معبود ہونے میں صرف اسی کا نام لیا ہے، کیونکہ عبادت صرف ملکِ حق، حقیقی حاکم'' ہی کے لیے ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسے ''رب العرش الکریم'' کہہ کر اس بیان کی تکمیل اور تائید کی ہے۔ یہ چاروں اوصاف معاد وقیامت کے اثبات کے لیے ہیں

---

[1] ''نسک'' ایک مفرد لفظ ہے، بہت سے ماہرین لغت نے اسے ہر قسم کی عبادت کے معنوں میں شمار کیا ہے، جب کہ بعض مفسرین نے اس کو خاص طور پر قربانی کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن اس کے لیے کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا ہے، بلکہ ظاہر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد تمام عبادت ہیں، اس لیے اس کا ذکر صلوٰۃ (نماز) کے بعد آیا ہے جو خاص کے بعد عام ذکر کی مثل ہے۔

جواس سے پہلے کی آیات میں آئے ہیں۔

''عرش کریم'' کے الفاظ میں تمام جہانِ ہستی کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ عرش کے معنی بادشاہوں کا بلند تر تخت ہیں اور خداوند تعالیٰ کا تختِ حکومت تمام جہان آفرینش سے کنایہ ہے، اس صورت میں عرش کا مفہوم جملہ ''رب کل شیء'' سے ہم آہنگ ہے جو آیات ماقبل میں آیا ہے۔

''کریم'' کے معنی باشرف، بہترین اور زیادہ فائدہ مند ہوتے ہیں، عرش کی اس لفظ کے ساتھ توصیف اس لیے ہوئی ہے کہ پروردگار عالم کا تحت حکومت سب سے بڑھ کر ان معنوں کا مصداق ہے۔ لیکن بعض مفسرین نے گمان کیا ہے۔ کہ وصف ''کریم'' کے معنی صاحب کریم ہیں، چونکہ یہ معنی عرش کے ساتھ صادق نہیں آتے، اس لیے یہ صفت خدائے پاک کی ہے نہ کہ عرش کی..... حالانکہ ''کریم'' غیر عاقل موجودات کی صفت بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً ''لھم مغفرۃٌ ورزقٌ کریم'' یعنی مومنوں کے واسطے بخشش اور پرفائدہ وباشرف (کریم) روزی ہے۔ (حج۔ ۵۰)[1]

(۵) پانچویں آیت انسانوں کے بارے میں ربوبیت خداوندی کو بیان کررہی ہے، اس میں پیغمبرِ ربانی حضرت الیاس کی زبانی ان کا اپنی قوم سے خطاب نقل ہوا ہے، آپ نے انہیں ایک مشہور بت ''بعل'' کی پرستش پر ملامت کرتے ہوئے فرمایا: خدائے تعالیٰ کہ جو احسن الخالقین ہے، تم لوگ کیوں اسے چھوڑ کر اس بت کے پیچھے لگ گئے ہو؟ پھر اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں۔ وہی خدا تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پروردگار ہے (اللہ ربکم ورب اٰبائکم الاوّلین[2])

یہ اصل میں دُنیا کے تمام بُت پرستوں کے لیے ایک مسکت جواب ہے، کیونکہ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ تم کیوں ان بتوں کی پرستش کرتے ہو تو وہ اپنے اعمال کی توجیہ کے طور پر کہتے ہیں: یہ ہمارے باپ دادا کی روش ہے اور ہم ان کی اس روش کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ حضرت الیاسؑ اپنے خطاب میں اس بات کو بنیاد بنا رہے ہیں کہ عبادت و پرستش کے لائق وہ ہے جو عالم ہستی کا رب اس کو ایک نظام کے تحت قائم رکھنے اور واقعاً انسان کی پرورش کرنے والا ہے۔ وہی خدا تمہارا اور تمہارے باپ دادا کا پرودگار ہے، اگر وہ اپنے معبود حقیقی اور اپنے پروردگار کی شناخت میں غلطی کر گئے تو اب تم کیوں اس غلط راہ پر چلے جارہے ہو۔

خدا ہی مدبر امور ہے:

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں ''رب'' کی بجائے ''تدبیر امر'' پر بات ہوئی ہے جو ''ربوبیت'' کے معنی کے قریب تر ہے نہ کہ کاملاً انہی معنی

---

[1] قرآن اور لغت کے اعتبار سے ''عرش'' کے معنی کے بارے میں تفصیلی مباحث سے آگاہی کے لیے تفسیر نمونہ فارسی جلد ۶ صفحہ ۲۰۴ ذیل آیت ۵۴ سورۂ اعراف..... نیز جلد ۸ صفحہ ۲۱۹ ذیل آیت ۳ سورۂ یونس کا مطالعہ کریں۔

[2] اس آیت میں ''اللہ'' منصوب یعنی زبر کے ساتھ ہے، اس لیے کہ یہ ''احسن الخالقین'' سے بدل ہے جو اس سے پہلے موجود ہے۔ بعض کا خیال ہے یہاں لفظ ''اللہ'' عطف بیان ہے۔

میں ہو۔اس آیت میں رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے ہوئے فرمایا گیا: (مشرکوں سے) کہو کہ کون تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟ (قل من یرزقکم من السماءِ والارض)۔

آفتاب کی رُوح پرور روشنی جو آسمان سے تم پر چمکتی ہے کہ تمہاری حیات وزندگی اس سے وابستہ ہے۔ بارانِ رحمت کی جاں بخش بوندیں جو آسمان (کی طرف) سے نازل ہوتی اور زندگی کا بیج جا بجا بکھیرتی ہیں اور ہوا جو ایک لطیف اور رُوح پرور چیز ہے۔اس نے تمہارے چاروں طرف کی فضاء کو پُر کر رکھا ہے بتاؤ یہ سب چیزیں کس نے تمہارے لیے مہیا کی ہیں؟

اسی طرح نباتات کہ جو زمین سے اُگتے ہیں، ان سے تم اناج اور لذیز میوے حاصل کرتے ہو بیش قیمت معدنی چیزیں جو تم زمین کی تہہ سے نکالتے ہو..... بتاؤ تو یہ چیزیں تمہیں کون عطا کرتا ہے؟ آیا یہ رزق وروزی بتوں کی طرف سے مل رہی ہے؟

اس کے بعد خود انسانی بدن کی طرف متوجہ ہو کر اعضاء بدن کے دو اہم حصوں کا ذکر کیا ہے کہ جن سے انسان اس دنیا کے ساتھ رابطہ پیدا کرتا ہے اور جو علم ودانش کے حصول کا وسیلہ ہیں ان کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے۔کون کان آنکھوں کا مالک (اور خالق) ہے؟ (امن یملك السمع و الابصار)۔

بعدہٗ عالم ہستی کے سب سے اہم معاملے یعنی مسئلہ موت وحیات پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کون زندہ کو مردہ میں سے اور مردہ کو زندہ میں سے نکالتا ہے؟ (ومن یخرج الحی من المیت و یخرج المیت من الحی)۔کیا یہ بتوں کی کارگزاریاں ہیں؟

آیت کے آخر میں اس کے بعد کہ تین اہم مسائل (رزق آسمانی وزمینی، کان آنکھ، اور موت وحیات) کا ذکر کیا جا چکا، سارے مضمون کو جامع طور پر بیان کرتے ہوئے فرمایا: کون امورِ عالم کی تدبیر کرتا ہے۔(وَمن یدبر الامر)۔

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ اگر وہ (مشرکین) اپنی عقل اور وجدان کی طرف مراجعہ کریں تو ان کی طرف سے ان ساری باتوں کا کوئی اور جواب ہو ہی نہیں سکتا۔فوراً وہ (تمہارے جواب میں) کہیں گے.....اللہ.....(فسیقولون اللہ) یعنی تمام امورِ عالم کی تدبیر کرنے والا وہی اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔

پھر اپنے رسول سے فرمایا کہ اسی جواب کو بنیاد بنا کر اس گفتگو کو آگے بڑھاؤ: کہو کہ پھر کیوں تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (فقل افلا تتقون) یعنی کیوں خدا سے نہیں ڈرتے اور راہ شرک پر چلتے ہو؟

درحقیقت اس آیت میں انسان کی تمام مادی ومعنوی روزیاں اور تمام تر تدبیر وعالمیان یکجا طور پر ذکر ہوئی ہیں مادی روزیاں زمین وآسمان سے اور معنوی روزیاں، یعنی علومِ حسی، عقلی ونقلی گوش وچشم کے ذریعے حاصل ہوتے ہیں، تدبیر جہاں میں ان کے ساتھ دیگر بہت سے امور بھی شامل ہیں۔

اندریں صورت کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہ ناتواں کر سکتا ہے کہ یہ ناتواں بندے بابتوں جیسی بے اصل چیز یہ رزق وروزی پیدا کرنے اور امورِ عالم کو چلانے کی اہل ہو سکتی ہے، پس توحید ربوبیت کوئی پیچیدہ نہیں، حتیٰ کہ اگر مشرک لوگ چندے غور وفکر کریں تو یہ ان پر بھی واضح اور روشن ہو جائے گا۔

خدا کو کان آنکھوں کی ''مالکیت'' کا حامل قرار دینا اس کے ان کو پیدا کرنے اور وجود میں لانے کی طرف اشارہ ہے یا ان کی حفاظت اور ان کے عجیب نظام کو قائم رکھنے یا ان سب امور کا خالق و مدبر ہونے کی وجہ سے ہے۔

آیات کے مذکورہ بالا مجموعے اور ان کے مشابہ دیگر آیاتِ قرآن کو جن کی تعداد بہت زیادہ ہے ان سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قرآن اس تمام عالمِ ہستی ہر شے ہر موجود، زمین و آسمان، عرش، وکرسی اور موجود و گذشتہ انسانوں کا خالق و مالک اور مدیر و مدبر خداوند تعالیٰ ہی کو قرار دیتا ہے اور بڑی صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ اس کے سوا جہانِ ہستی میں کوئی اور ''رب'' اور پروردگار نہیں ہے۔

توضیحات

(۱) توحید یعنی درمیانی واسطوں کو حذف کرنا:

قرآن مجید کی آیات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ انسان براہ راست خدا کی طرف توجہ کریں اور درمیانی واسطوں میں گم ہو کر نہ رہ جائیں، اسی سے بات کریں، اسی سے تقاضا کریں اسی کے حضور سجدہ ریز ہوں اور اسی کی بارگاہ میں شکرِ نعمت بجالائیں، تمام مشکلات کا حل اسی سے طلب کریں، اسی کے ساتھ عشق و محبت رکھیں بس اسی کیساتھ دل لگائیں اور اس کے غیر کی پرستش ہرگز نہ کریں۔

سورۂ حمد اور دیگر سورہ ہائے قرآن میں ''رب'' ''العالمین'' کی تعبیر اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور رکوع وسجود میں .....سبحان ربی العظیم.....اور.....سبحان ربی الاعلیٰ.....کا کئی کئی بار دو ہرایا جانا بھی اسی بات کی تاکید کے لیے ہے۔ ہاں تو نہ صرف ہماری خلقت و پیدائش بلکہ ہماری بقاء ہماری خلقت و پیدائش بلکہ ہماری بقاء ہماری تربیت ہمارا تکامل اور ہمارے تمام امور کی تدبیر بھی خداوند تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

اس بات کی واضح دلیل موجود ہے، کیونکہ ''خالق'' اور ''رب'' اپنی مخلوق سے جدا نہیں ہوسکتا۔ اگر ہم صحیح طور پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر لحظہ ایک نئی خلقت اور ایک نئی پیدائش حاصل کرتا ہے جو اسی پروردگار کی طرف سے عطا ہوتی ہے، مختصر یہ کہ تمام موجودات اس کی محتاج دنیاو نیازمند ہیں اور وہ ہر جہت سے بے نیاز ہے، وہ ''صمد'' یعنی ایسا عظیم آقا و مالک ہے کہ ہر حاجت مند اسی کی بارگاہ میں پہنچتا ہے۔

تاریخ مذاہب سے پتہ چلتا ہے کہ عالم بشریت اپنے اور اپنے رب کے مابین خود ساختہ واسطوں اور وسیلوں میں گم ہو کر کیسے کیسے نامعقول اور بے ہودہ افکار و افعال میں گرفتار ہوا ہے، اس نے اپنے مقابلے میں پست تر موجودات یعنی بتوں اور مورتیوں کو اپنا معبود قرار دیا اور ان کو زندگی اور اپنے سود و زیاں کا مالک سمجھتا رہا۔ پھر خداؤں اور معبودوں کی اس کثرت نے انسانی معاشروں کو تفرقہ و نااتفاقی، بدبختی و بدحالی اور دنائت و پستی کے سوا کیا کوئی اور تحفہ دیا ہے؟ لیکن جب یہ واسطے درمیان سے ہٹا دیئے گئے اور ہم نے اسی ذات کو رب مطلق مان لیا تو جیسا کہ دلائل عقلیہ کا تقاضا ہے ہم نے ہر چیز کو اسی کا نیازمند پایا، اسی طرح ہم نور عظمت، وحدت اور یگانگت کے سرچشمے تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں خدا کی صفت ''رب'' کا نو سو سے زیادہ مرتبہ ذکر آیا ہے اور اوصافِ الٰہی میں سے کسی وصف کی اس

قدرتا کید نہیں ہوئی اس لئے اسلام کے نظریہ توحید خالص کو سب سے پہلے اسی توحید ربوبیت میں دیکھا جانا چاہیے۔

(۲) تاریخ مذاہب اور بے اصل واسطے:

تاریخ مذاہب کا جتنا زیادہ مطالعہ کیا جائے اسی قدر یہ بات کچھ اور واضح ہوتی ہے کہ مختلف قوموں میں (رب و پروردگار کے معنی میں) چند خداؤں کا عقیدہ قدیم ترین زمانے سے موجود رہا ہے۔ اگر ان کے خداؤں کے نام اور ان کے بارے میں ان لوگوں کے عقائد کا ذکر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی جو عجیب وغریب اور بے ہودہ نظریات سے پر ہوگی تاہم اس میں کوئی ہرج نہیں کہ ہم یہاں اس موضوع کو بطور خلاصہ بیان کر دیں تا کہ قارئین اس اختصار سے اس کی تفصیلات کے بارے میں ایک تصور قائم کر سکیں۔

(۱)۔ رومیوں کے خدا:

ایک معروف مغربی مورخ اس سلسلے میں رقمطراز ہے: رومیوں کا مذہب ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا جیسا کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں..... ان کے مذہب نے اپنے ماننے والوں کو کوئی حکم نہیں دیا تھا، اس میں لوگوں کی اخلاقی خرابیوں کی اصلاح کے لیے کچھ بھی اہتمام نہ تھا اور وہ انہیں صرف اپنے خداؤں کو خوش کرنے کے رسوم سے آگاہ کرتا تھا۔

رومیوں کے خداؤں کی ایک بڑی تعداد وغیر معمولی قوتوں کی حامل تھی، کیونکہ ان میں سے ہر ایک زندگی کے کسی خاص گوشے سے تعلق رکھتا اور کوئی مقررہ کام انجام دیتا تھا۔ نہ صرف گھر کی دہلیز کا ایک خدا ہوتا تھا بلکہ جوتے اُتارنے کی جگہ اور ڈیوڑھی کے لیے بھی الگ الگ خدا ہوتے تھے علاوہ ازیں ہر فرد کا محافظ ایک ایک خدا ہوتا اور پھر ذیلی خدا ہوتے، مثلاً ایک خدا نومولود کو پہلی آواز نکالنے کا ڈھنگ سکھاتا، دوسرا کھانے پینے کا طریقہ بتاتا، ایک اور خدا گھر سے نکلنے کی ترکیب سمجھاتا اور ایک خدا گھر واپس آنے کی تعلیم دیتا تھا۔ ایک مخصوص خدا ہل چلانے میں، ایک خدا کیاریاں بنانے میں اور ایک تیسرا خدا بیج بونے میں مدد کرتا اسی طرح کچھ اور خدا بھی تھے جو مختلف کاموں میں برکت دیا کرتے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ رومیوں کے ایک ہزار خدا ہوں۔ جیسا کہ ان کے روساء میں سے ایک نے مذاق کے طور پر کہا تھا کہ ہمارے ملک کے مندروں اور گھروں میں خداؤں کی تعداد ہماری قوم کے افراد سے کہیں زیادہ ہے [1]

(۲) یونانیوں کے خدا:

وہی معروف مورخ لکھتا ہے: دوسری بہت سی قوموں کی طرح یونانیوں نے بھی سُورج، آسمانی بجلی، سمندر، آندھی، دریا، چشمہ، ہوا اور بارش جیسی تمام طبعی چیزوں کو مقام الوہیت پر فائز کرتے اور ان کو پوجتے تھے ہر باطنی اثر و تاثیر کو ایک ان دیکھی شخصیت سے نسبت دیتے اور انہیں خیر و شر کے مالک تصوّر کرتے تھے وہ ان کی پرستش کرتے تا کہ وہ ان پر مہربانی کریں یا اپنے ضرر کو ان سے دُور رکھیں:۔

---

[1] تاریخ آلبرمالہ۔ تاریخ روم جلد ا صفحہ ۲۹۔۳۰۔

پھر وہ ''کرونوس'' کے بیٹے ''زوس'' کا ذکر کرتا ہے جو یا نانیوں کا بڑا خدا تھا وہ اسے ایک ایسا آدمی تصور کرتے جو قوی ہیکل، بارعب، کشادہ پیشانی، لمبی زلفوں اور گھنی گھنگھریالی داڑھی والا ہے۔ زوس یونان میں رب الارباب اور خدائے شر سمجھا جاتا ہے اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے خداؤں کے بت رکھے ہوتے اس کی بیوی ''ہرا'' جس کا مسکن آسمان میں تھا، اس کے تین بیٹے، ہرمس، آرتمیس، آیولون، مانے جاتے اور یہ تینوں ترتیب وار بارش، چاند، سورج کے مالک تصور کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ یہ لوگ اور بھی بہت سے خداؤں کے قائل تھے۔ مثلاً دریاؤں کے خدا، زمین کے خدا، تہہ زمین کے خدا اور پھر ہر کام کے لیے الگ الگ خدا ہونے کے معتقد تھے [1]

(۳) مصریوں کے خدا:

قدیم مصریوں میں سے اکثر لوگ کئی خداؤں (ملی تہہ السیم) کے معتقد اور ان میں سے ایک کو دوسروں سے برتر اور خدائے خدایان کے طور پر مانتے تھے۔ مصر کے ہر حصے میں لوگ اپنا خدا اور اپنا معبد (مندر) بنائے ہوئے تھے اور مجموعی طور پر ان کے خداؤں کی تعداد دو ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہوا کرتی تھی۔ لیکن ان میں نو خداؤں کا بہت چرچا تھا اور وہ یہ ہیں: سورج کا خدا، فضاء کا خدا زمین کا خدا صحرا کا خدا، پہاڑوں کا خدا، سمندروں کا خدا، آباوزمین کا خدا، صحرا کا خدا، پہاڑوں کا خدا، سمندروں کا خدا، آباوزمین کا خدا اور بنجر زمین کا خدا [2] ایک اور مورخ ''ویل ڈورانٹ، اپنی کتاب'' تاریخ تمدن'' میں کہتا ہے۔ دنیا کے کسی خطے میں اتنے زیادہ خدا نہیں پائے گئے جتنے مصر میں تھے۔ اہل مصر کہا کرتے کہ خلقت وآفرینش کا آغاز آسمان سے ہوا اور آسمان میں دریائے نیل سب سے بڑا رب النوع شمار ہوتا ہے۔ مصریوں کے اعتقاد میں ستارے صرف ایک جسم ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ خداؤں کے ارواح کی مادی صورتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ستاروں، حیوانوں اور درختوں کی شکلوں پر بنائے ہوئے بتوں کی صورت میں بہت زیادہ خدا تھے، یہاں تک کہ ان کی عبادت گاہیں اچھے خاصے نمائش گھروں کا نقشہ پیش کرتی تھیں [3]

(۴) ایرانیوں کے خدا:

قدیم ایرانی بھی پہلے ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش اور پھر کئی خداؤں کی پوجا میں لگے رہے، تاہم کہیں کہیں، امشاسپندان، یعنی چھ خداؤں کی پرستش بھی ہوتی تھی۔ یعنی پالتو حیوانوں کا خدا، آگ کا خدا، دھاتوں کا خدا، زمین کا خدا، دریاؤں اور درختوں کا خدا، ستاروں اور سیاروں کا خدا [4]

---

[1] تاریخ ''آلبرمالہ'' تاریخ ملل شرجلد ۲ صفحہ ۱۷ تا ۱۷۹ (خلاصہ)

[2] اسلام وعقائد وآراء بشری صفحہ ۴۶۔

[3] ویل ڈورانٹ، تاریخ تمدن جلد ۱ صفحہ ۲۹۸، ۳۰۰ (خلاصہ)

[4] اسلام وعقائد وآراء بشری صفحہ ۳۴۔

(۵) چینیوں کے خدا:

چین کے قدیم باشندے معتقد تھے کہ دنیا میں دو اصلیں حکومت کر رہی ہیں، پہلی اصل ''نر'' یا ''مثبت'' یا ''نور'' اور دوسری اصل ''مادہ'' یا ''منفی'' یا ''ظلمت'' ہے۔ اپنے اسی فکر و خیال کے نتیجے وہ ثنویت، دوگانہ پرستی اور دو خداؤں کی پرستش کرنے لگے۔

''شانگتی'' اصل نرینہ و مذکر شمار کیا جاتا اور اسے خدائے آسمان تصوّر کیا جاتا تھا، ان کا خیال تھا، کہ یہی اس دنیا میں انسان کو نیک و بداعمال کی جزو اسزا دیتا ہے۔ اور جب گناہ عام ہو جائے تو لوگوں پر سخت مصیبت نازل کرتا ہے۔

وہ ''ہاتن'' کو اصل مادہ و مونث قرار دیتے اور اس کی تعریف و توصیف کرتے تھے، پھر آہستہ آہستہ کچھ دوسرے خدا بھی بنا لیے گئے اور وہ لوگ بہت سے خداؤں کی پرستش کرنے لگے، مثلاً پیداوار کا خدا، بارش کا خدا، ہوا کا خدا، برف کا خدا، آگ کا خدا، اور پہاڑوں کا خدا وغیرہ[۱]

(٦) عرب کے بُت پرست:

بعض مورخین اور مفسرین کا خیال ہے کہ عرب کے لوگ خدائے واحد ہی کو جہانِ ہستی کا خالق ورزاق اور رب و مدبر سمجھتے تھے، اس کے ثبوت میں وہ ایسی آیات قرآن پیش کرتے ہیں، جن میں ان لوگوں کی زبانی خدا کی خالقیت ورازقیت پر اعتقاد رکھنے کے اعتراف کا ذکر ہے۔ اس لیے ان کی بت پرستی کا موجب کئی خداؤں کا ماننا نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان سے حصولِ شفاعت اور تقرب خدا کی امید رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کا اعتقاد تھا کہ ہر بت کے ساتھ بہ حکم خدا ایک شیطان کو موکل بنایا جاتا ہے، اگر کوئی شخص کسی بُت کی قرار واقعی عبادت بجالاتا ہے تو وہی شیطان خدا کے حکم سے اس کی حاجتیں پوری کرتا ہے[۲]

لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربوں کا ایک گروہ ستارہ پرستی کی طرف مائل تھا، ان کا نظریہ تھا کہ کچھ ستارے طلوع وغروب کے وقت بارش برساتے ہیں۔ وہ ان ستاروں کو ''انواء'' سے تعبیر کرتے تھے (انواء جمع ہے، ''نوء'' کی' اور اس سے مراد وہ ستارہ ہے جو ڈوبتا جارہا ہو) وہ اپنی حرکت وسکون اور سفر وقیام کو ان ستاروں کے ساتھ مربوط رکھتے تھے (کیونکہ انہیں قسمت اور نصیب میں موثر خیال کرتے تھے) لہٰذا انہوں نے سورج، چاند اور زہرہ وغیرہ کی پرستش کے لیے بڑے بڑے عبادت خانے بنار کھے تھے[۳]

جزیرنما عرب کے جنوب میں یمن کا علاقہ ہے اور وہاں آباد عرب قبائل میں بھی ستارہ پرستی کا روج تھا۔ ان میں ایک گروہ ''آفتاب پرست'' تھا کہ جس کی طرف قرآن نے ملکہ سبا کی داستان میں واضح اشارہ کیا ہے، بعض قبائل ''مہتاب پرستی اختیار کیے ہوئے تھے بعض ستارہ

---

[۱] اسلام وعقائد وآراء بشری صفحہ ۱۵۷۔

[۲] بلوغ الارب جلد ۲ صفحہ ۱۵۷۔

[۳] بلوغ الارب صفحہ ۲۲۳۔

شعریٰ کے پرستار اور اسی طرح دیگر قبائل بعض دوسرے ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔[1]

(۷) مختلف ممالک کے خدا:

دنیا کے دیگر ملکوں جیسے ہندوستان وجاپان وغیرہ میں بھی لوگ اربابِ انواع اور بہت سے خداؤں پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ''صائبین'' (ستارہ پرست) سات سیاروں کو ہفت اقلیم کے نگہبان سمجھتے تھے نیز وہ انہیں اہل زمین کے لیے سرچشمہ خیر اور ان کی مصیبتوں کو رفع کرنے والے خداؤں کا درجہ دیتے تھے۔

''توتم'' کا نظر جو اس وقت دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا، وہ ابھی ارباب انواع کے عقیدے کے ساتھ ملتا جلتا ہی تھا۔ کیونکہ ہر قبیلے کا ایک ''توتم'' ہوا کرتا کہ جو اس قبیلے کے باپ اور رُوح کی منزلت کا حامل ہوتا تھا، وہ لوگ اسے حیوانات کی شکل میں ان جیسا تصور کرتے تھے۔

(۸) مثل افلاطونی پر اعتقاد:

افلاطون نے عالمِ طبیعت کی ہر انواع کے لیے ایک ایک مجرد عقلی فرد قرار دیا اور وہ لوگ اسے قائم بالذات سمجھتے تھے چونکہ وہ ان مجرد وافراد کو اسماء وصفاتِ الٰہی کے مظاہر وامثال خیال کرتے تھے۔ اس لیے انہیں ''مثال'' کے نام سے موسوم کرنے لگے اور مثال کی جمع مثل بروزن رُسل ہے۔

افلاطون کا نظریہ تھا کہ جو چیز کوئی حقیقت رکھتی ہے وہ وہی مثال ہے کہ جو مطلق، غیر مبدّل، زمان ومکان سے بلند اور کلی وابدی وجود ہے۔ یہ ماوی وجسمانی افراد وجسمانی افراد جو نظر آتے ہیں۔ متعدد تغیر پذیر، یا پابند زمان ومکان اور فانی ہیں، یہ فقط اس مثال کے پرتو کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا یہ جسمانی افراد انسان اس مثالی انسان سے وہی نسبت رکھتے ہیں جو کسی سائے اور اصل وجود میں ہوتی ہے، گویا افلاطون کے نزدیک یہ عالم ظاہر وعالم محسوسات ''مجاز'' ہے اور حقیقت وہی عالمِ معقولات ہے[2]

مثل افلاطون پر اعتقاد اگرچہ ارباب انواع کے عقیدے سے مختلف ہے، لیکن بعض جہات سے اس کے مشابہ ہے اور یہ ارباب انواع کے یونانی عقیدے کا مدہم سا فلسفی نقش ہے، اسی طرح، عقول مجرد فلکیہ کا نظریہ بھی ارباب انواع کے عقیدے سے ایک طرح کی قربت رکھتا ہے۔

اس کی وضاحت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ بعض فلاسفہ کے بقول چونکہ خدائے تعالیٰ ہر جہت سے بسیط ہے۔ لہٰذا اس کی مخلوق بھی ایک ہی ہوگی اور وہ مخلوق مجرد ہے کہ اسے ''عقل اوّل'' کا نام دیتے ہیں۔ پھر وہ یہ کہتے ہیں کہ ''عقلِ اوّل'' جب ایک وجود اور ماہیت ہے اور دو

---

[1] اسلام اور جاہلیت صفحہ ۲۹۵

[2] دیکھیے کلیات فلسفہ اسلامی، سیر حکمت در اروپا اور ایسی ہی دیگر کتب۔

جنبے رکھتی ہے، لہٰذا اس سے ''عقل دوم'' اور ''فلک اوّل پیدا ہوا اور اسی ترتیب سے وہ دس عقول اور نو آسمانوں کی پیدائش کے قائل ہیں۔

ان میں سے کچھ فلاسفہ بہ لحاظِ تعداد عقول کو بے شمار قرار دیتے ہیں اور ''عقول طولی (دس عقول جن میں سے ہر ایک دوسرے کی مخلوق ہے) کے علاوہ ''عقولِ عرضی'' کے معتقد بھی ہیں، وہ انہیں ''صور نوعیہ'' کے فیض کا واسطہ اور موجوداتِ جسمی کا مرتبہ اعلیٰ تصور کرتے ہیں، جیسے ارباب انواع اور مثل افلاطونی ہیں۔ البتہ ان مسائل میں سے ہر ایک کے بارے میں بہت سے مباحث ہیں، چونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لیے ہم ان سے صرف نظر کرتے ہیں۔ اس بیان میں جو چیز ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم اس بات کو سمجھ لیں کہ قرآن مجید نے ان تمام افکار کا مقابلہ کیا ہے، چنانچہ اس نے ان سبھی شرک آلود افکار اور مختلف مشرکانہ فلسفی مکاتب میں گزرتے ہوئے جس وضاحت اور خوبی کے ساتھ عالمِ ہستی میں توحید خالقیت و توحید ربوبیت (یعنی خالق و رب واحد) کے وجود کو ثابت کیا اور توحید خالص کو اجاگر کیا ہے اسے قرآن کے معجزات میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

قرآن نے ان فرضی خداؤں اور خیالی ارباب انواع کے وجود بے سود پر خط تنسیخ اور فقط ''رب العالمین'' کو ''اللہ'' قرار دیا یہاں تک کہ ہر چیز اور ہر شخص کو مخلوق اور اس کی تدبیر و تربیت کے تحت شمار کیا، انسانوں کے دلوں اور جانوں کو نور وحدت سے روشنی بخشی اور ان کی توجہ ہر طرف سے ہٹا کر اس خدائے واحد لایزل کی ذات پر مرکوز کر دی۔

ہاں ان حالات سے یہ بات بخوبی واضح ہو رہی ہے کہ توحید خالص کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ انسان اپنے پاؤں چل کر اس تک جا پہنچے، بلکہ ضروری ہے کہ طریق وحی سے ایک غیبی ہاتھ اس کی طرف بڑھے اور اسے سنبھالا دے کر منزلِ توحید پہنچا دے۔ یعنی وہ ذاتِ مقدس جو وصف یکتائی کی حامل ہے۔ اس کے پیغمبر آئیں اور انسان کا ہاتھ پکڑ کر خضر راہ کی صُورت میں اس کو شرک کی تاریک وادی سے نکال کر توحید خالص کے آبِ حیات تک لے جائیں اور اسے سیراب کر دیں۔

(۳) تفویض بھی شرک ہے:

اگرچہ تفویض کے کئی معنی ہیں اور بعض نے اس کے سات اقسام شمار کیے ہیں۔ نیز ان میں سے ہر ایک کے بارے میں بڑے بڑے مباحث موجود ہیں۔ لیکن یہاں جس نوع تفویض کا ذِکر لازم ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تفویض گروہ پیدا ہوا جن کا اعتقاد ہے کہ خدا نے پیغمبر اکرمؐ و ائمہ معصومینؑ کو پیدا کیا اور پھر خلق و رزق اور موت و حیات کا کام انہی کے سپرد کر دیا ہے۔

اس عقیدے کے متعلق بہترین تبصرہ وہی ہے جو علامہ مجلسیؒ نے ''مرأۃ العقول'' میں کیا اور فرمایا ہے۔ کہ ان قائلین تفویض کا یہ قول دو معنوں کا حامل ہو سکتا ہے۔

(۱) معصومین اس دنیا میں خلق و رزق اور موت و حیات کے اُمور اپنی قوت اور اپنے ارادے سے انجام دیتے ہیں اور وہ ان کے فاعلِ حقیقی ہیں، یہ صراحتاً کفر ہے اور دلائل عقلی و نقلی اس عقیدے کا بطلان کرتے ہیں، نیز اس عقیدے کے حامل لوگوں کے کفر میں کسی بھی عاقل کو ذرہ بھر شک نہیں ہے۔

(۲) معصومینؑ کے قصد وارادہ کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی ان کاموں کو انجام دیتا ہے، جیسے شق القمر، مردہ کو زندہ کرنا اور انبیاء سابقین کے معجزات رونما ہوتے رہے ہیں، اگر تفویض سے ان کی مراد یہی ہو تو خلافِ عقل نہیں۔ مگر ہم نے بحارالانوار میں ایسی بہت سی روایات کا ذکر کیا ہے۔ جو معجزات کے علاوہ معصومینؑ سے ان اُمور کے صدور کی نفی کرتی ہیں [1]

بہرحال دوسرا احتمال عقلاً محال نہیں ہے، لیکن روایات اس کی تائید نہیں کرتیں، ایسے بہت سے امور ہیں جو عقلاً محال نہیں مگر شرعاً ان کی نفی کی گئی ہے، جیسے انبیاء وائمہ علیہم السلام کی تعداد.....یعنی عقلی طور پر ممکن تھا کہ ان کی تعداد اس سے زیادہ ہوتی، تاہم نقلی دلائل نے اسے اس تعداد میں منحصر کر دیا ہے، جس کا ہمیں علم ہے۔

اس سلسلے میں ایک تیسرا احتمال بھی وجود رکھتا ہے وہ یہ کہ خدائے تعالیٰ کسی پیغمبر یا امام کو یہ قوت عطا کر دیتا ہے کہ وہ اذنِ الٰہی سے کسی مُردہ کو زندہ کرے یا کسی لاعلاج مریض کو شفا دے دے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ سے متعلق آیاتِ قرآن کے ظاہری معنی یہی ہیں اور یہ امر دیگر معصومینؑ کے بارے میں بھی ممکن ہے۔ لیکن جیسا کہ عبارتِ بالا میں ذکر ہوا۔ یہ بات صرف معجزات وکرامات تک محدود ہے نہ کہ خلقت آسمان وزمین اور امورِ کائنات کی تدبیر تک وسعت رکھتی ہو۔ کیونکہ قرآن بڑی صراحت کے ساتھ ساری کائنات کی خلقت، تدبیر ور بوبیت کو خاص خدائے تعالیٰ ہی کے لیے قرار دیتا ہے۔ (اس فصل میں توحید ربوبیت سے متعلق پیش کی گئی آیات اس امر کی نشاندہی ہیں)

البتہ اس لحاظ سے کہ خلقت وآفرینش کا اصلی ہدف ''انسان کامل'' ہے اور معصومینؑ بھی کامل انسانوں سے بلند وبالا ہیں، اس لیے کہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس عالمِ ہستی کو انہی کی خاطر وجود میں لایا گیا ہے اور بہ الفاظ دیگر عالمِ ہستی کی علت غائی وہی ہیں۔

(۴) ایک سوال کا جواب:

کیا فرشتے مدبر امر ہیں؟

سورۂ نازعات (آیت ۵) میں مدبرات امر کی قسم کھائی گئی ہے، جیسا کہ فرمایا: فالمدبرات امراً۔ اس میں مفسرین کا مشہور قول ہے کہ اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو امورِ دُنیا کی تدبیر کرتے ہیں آیا یہ مسئلہ توحید ربوبیت کے منافی نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب بڑا واضح ہے کہ اگر یہ فرشتے اپنے فرشتے اپنے فعل اور تاثیر میں مستقل ہیں تو یہ چیز عقیدۂ توحید کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی، لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ محض فرمان الٰہی کو عمل میں لاتے ہیں اور خدا کی مشیت وارادہ کے تحت ان اُمور کے ذمہ دار ہیں، جیسے عالم طبیعت میں اسباب ہیں کہ فرمانِ خداوندی کی بناء پر ایک اثر رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بہت سے مفسرین کے زیر نگاہ رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے خداوند تعالیٰ کے ''رب العالمین'' اور رب کل شئ ہونے اور جہانِ کائنات میں عالمِ اسباب کی تاثیرات اور فرشتوں کی طرف سے بحکم خدا امورِ عالم کی تدبیر کرنے کے درمیان کوئی تناقص محسوس نہیں کیا، یہاں وہی

---

[1] مرآۃ العقول جلد ۳ صفحہ ۱۴۳ (خلاصہ)

صورت ہے، جیسا کہ خدائے تعالیٰ قرآن میں خود کو تمام موجودات جہاں کا رازق وروزی وہندہ شمار کرتا ہے: وما من دابۃٍ فی الارض الاعلیٰ اللہ رزقھا۔ (ھود ٦)

لیکن ایک اور مقام پر فرماتا ہے: وعلیٰ المولودلہٗ رزقھن و کسوتھن بالمعروفِ (بقرہ۔ ٢٣٣) یعنی ہر شیر خوار بچے کے باپ پر لازم ہے کہ اس کی ماں کو (دودھ پلانے کی مدت میں) عمدہ خوراک و پوشاک مہیا کرے (اگر چہ طلاق لے چکی ہو)۔

یہ مسلمہ بات ہے کہ شیر خوار بچے کے باپ کو ''روزی دینے والا کہنے'' اور خداوند تعالیٰ کو روزی دینے والا، کہنے میں کوئی تضاد نہیں ہے کہ کیونکہ ان میں سے ایک ظاہری، عارضی اور اپنے خالق سے وابستہ ہے دوسرا مستقل اور بالذات روزی رساں ہے۔

نیز یہ کہ اگر ہم کہتے ہیں کہ شہد میں شفا ہے ''فیہ شفآءٌ للناس (نحل۔ ٢٩) یہ اس بات کے منافی نہیں کی شفا دینے والا صرف خدا ہے، جیسے عقیدہ توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بقول قرآن میں آیا ہے: واذا مرضت فھو یشفین (شعرائ۔ ٨٠) یعنی جب میں بیمار ہوجاتا ہوں تو خدا مجھے شفا دیتا ہے۔

یہ سب آیاتِ علت ومعلول کے سلسلے کو بیان کررہی ہیں۔ یعنی معاملہ ایک علت غیر مستقل سے شروع ہوکر علت العلل تک پہنچتا ہے جو مسبب الاسباب خدا ہے کہ ہر سبب اپنی تاثیر اور اپنے نتیجے میں اس کا محتاج ہے۔

(۵) احادیث اسلامی اور توحید ربوبیت:

توحیدِ ربوبیت کا ذکر معصومینؑ کی کی حدیثوں اور دعاؤں میں بھی پوری تابانی کے ساتھ موجود ہے، وہ بہت سی دعائیں جو اصولِ کافی کی جلد دوم میں منقول ہیں، ان میں درج ذیل عبارات میں اس مسئلے کی طرف واضح اشارات دیکھے جاسکتے ہیں۔

اللھم رب السمٰوٰت اسبع ورب الارضین السبع...رب العرشِ العظیم ...رب المشعرالحرامِ ورب البلد الحرامِ ورب الحل والحرام...الحمد للہ رب الصباح...رب الملائکۃِ والروح...رب المستضعین...رب جبرآئیل ومیکآئیل واسرافیل ورب القرآنِ العظیم ورب محمدٍ خاتم النبین۔ [1]

ان عبارات میں سے بعض روایات اہل سنت میں بھی آئی ہیں [2]

---

[1] اصول کافی جلد ٢ صفحہ ٥١٤ تا ٥٨٥۔

[2] مزید وضاحت کے لیے ''المعجم المفہرس الالفاظ الحدیث النبوی ٣ صفحہ ٢٠٧ کی طرف رجوع کریں۔

اس طرح آسمان وزمین، انبیاء وملائکہ امراء وغرباء صبح وشام، مکہ وکعبہ اور عرشِ عظیم کا رب خدائے قادر ویکتا کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

اصولی طور پر امورِ جہان کی ہم آہنگی اور اس میں کارفرما نظاموں کا باہم مربوط ہونا ہی اس کے منتظم کی وحدت ویکتائی کی ایک روشن دلیل ہے چنانچہ امام جعفر صادقؑ کی ایک حدیث میں ہم پڑھتے ہیں کہ جب ایک زندیق نے واحدنیت پروردگار کے بارے میں آپ سے سوال کیا تو فرمایا۔

فلما راينا الخلق منتظماً ،والفلك جارياً ، واختلافِ اليل والنهارِ وَ لشمس والقمر، دل صحة الامر والتدبير وائتلافِ الامرِ علىٰ ان المدبر واحدٌ۔

یعنی جب ہم مخلوقات کو منظم حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ افلاک کی حرکت، دن رات کی آمدورفت، سورج اور چاند کا ایک نظام کے تحت طلوع وغروب فرمان وتدبیر کی یہ درستی اور تمام امور کا ایک دوسرے سے یہ ارتباط اس بات کی دلیل ہے کہ اس ساری کائنات کے نظام کو چلانے والا مدبر و پروردگار ایک اور صرف ایک ہے [1]

---

[1] توحید صدوق باب ۳۶ باب الرد علی التنویہ والزنادقہ صفحہ ۲۴۴۔

(۳) توحیدِ مالکیت وحاکمیت تکونی

اشارہ:

''توحیدافعالی'' کی اہم ترین شاخوں میں سے ایک شاخ ''توحید مالکیت'' ہے یعنی بہ لحاظ تکوین و بہ لحاظ تشریع مالکِ حقیقی خدا ہی کی ذات پاک ہے اور دیگر تمام مالکیتیں غیر مستقل اور عارضی (مجازی) ہوتی ہیں، اس کی توضیح یہ ہے کہ مالکیت کی دو اقسام ہیں..... مالکیت حقیقی (تکوینی) اور مالکیت حقوقی (تشریعی)

مالکِ حقیقی وہ ہے جو کسی چیز پر تکوینی و خارجی تسلط رکھتا ہو، لیکن مالکیت حقوقی وتشریعی وہ قرارداد ہے جس سے کسی چیز پر قانونی حکم کا اجراء کیا جاتا ہے، جیسا کہ انسان کی مالکیت اپنے اموال پر ہے۔ ہر دو قسم کی مالکیت ایک موحد کی نظر سے پہلے درجہ میں خدا کے لیے خاص ہے کہ وہ دنیا کی تمام چیزوں کے وجود پر مالکیت کا اختیار رکھتا ہے، کیونکہ سب موجودات اسی کی مخلوق اور اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ وہ وجود کا فیض لحہ بہ لحہ اسی سے حاصل کرتی اور اس کی محتاج اور نیاز مند ہیں، اس ترتیب سے اس کی مالکیت حقیقی ہر چیز پر ہر جہت سے ثابت ہوتی ہے۔

مالکیت تشریعی وحقوقی یعنی قانونی مالکیت کے اعتبار سے بھی ہر چیز اسی کی مالکیت ہے، کیونکہ تمام اشیاء عالم کا خالق، پیدا کرنے والا اور انہیں وجود میں لانے والا وہی ہے۔ حتیٰ کہ جن چیزوں کو ہم وجود میں لاتے ہیں ان کے لیے مواد اور دیگر وسائل بھی اسی کے عطا کردہ ہیں، بناء بریں سب چیزوں کا مالک اصلی خدا ہے۔ اگرچہ کچھ مدت کے لیے اس نے یہ اشیاء امانت ہمارے سپرد کر رکھی ہیں۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف رُجوع کرتے اور آیاتِ ذیل پر نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ ۖ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۖ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۶ ﴿آل عمران: ۲۶﴾

(۲) اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۱۰۷ ﴿البقرۃ: ۱۰۷﴾

(۳) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۶ ﴿الزمر: ۶﴾

(۴) وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۴۷ ﴿البقرۃ: ۲۴۷﴾

(۵) ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ

قِطۡمِيۡرٍؕ ۱۳ ﴿فاطر: ۱۳﴾

(۶) قُلِ ادۡعُوا الَّذِيۡنَ زَعَمۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ۚ لَا يَمۡلِكُوۡنَ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ فِى
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا لَهُمۡ فِيۡهِمَا مِنۡ شِرۡكٍ وَّمَا لَهٗ مِنۡهُمۡ مِّنۡ
ظَهِيۡرٍ ۲۲ ﴿سبا: ۲۲﴾ [۱]

ترجمہ:

(۱) (اے پیغمبرؐ) کہو کہ اے اللہ تو حکومتوں کا مالک ہے، تو ہی جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے، تمام خوبیاں تیرے دستِ قدرت میں ہیں، کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

(۲) آیا تمہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کا مالک خدا ہے؟ (وہ حق رکھتا ہے کہ اپنے مصالح کے مطابق احکام میں تبدیلی کردے)، خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست و مددگار نہیں ہے۔ (وہی تمہاری مصلحت کو جانتا اور اس کا تعین کرتا ہے)۔

(۳) وہی خدا تمہارا پروردگار ہے (عالمِ ہستی کی) حکومت اسی کے لیے ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر کیوں تم راہِ حق سے منحرف ہو رہے ہو۔

(۴) خدا یا اپنا ملک جسے چاہے بخش دیتا ہے، خدا (احسان کرنے میں) وسعت رکھتا ہے اور وہ (افراد کی لیاقت برائے منصب سے) آگاہی رکھنے والا ہے۔

(۵) وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے (سارے جہان کی) حکومت اسی کے لیے ہے اور اس کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے مالک بھی نہیں ہیں۔

(۶) (اے پیغمبر!) کہو کہ جن کو بزعم خویش تم خدا کے سوا پکارتے ہو (وہ تمہاری کوئی مشکل حل نہیں

---

[۱] قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں مذکورہ آیات سے ہم آہنگ بہت سی آیات آئی ہیں۔ جیسے آیت ۱۷۔۱۸۔۴۰۔۱۲۰ مائدہ، ۱۵۸۔اعراف، ۱۱۶۔توبہ، ۱۱۱۔اسراء، ۲۔فرقان، ۱۰۔ص، ۴۴۔زمر، ۴۹ شوریٰ، ۸۵۔زخرف اور دیگر آیات

کر سکتے) کیونکہ انہیں آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر اختیار نہیں، نہ وہ ان کی خلقت میں شریک ہیں اور نہ وہ اس میں خدا کے مددگار ہیں۔

مفردات کی تشریح:

''ملک'' جیسا کہ مقابیس اللغۃ میں آیا ہے، اس کے معنی کسی چیز پر قوت رکھنا ہے اسی لیے ''تملیک'' بہ معنی قوت آتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ وہاں استعمال ہوا جہاں انسان کسی چیز کا مالک ہو کیونکہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے، اسی لیے اس پانی کو ''ملک'' کہا جاتا ہے، جو مسافر کے پاس ہوتا ہے، کیونکہ جب مسافر کے پاس پانی ہو (خصوصاً پہلے زمانے کے بیابانی سفر میں) تو وہ اپنے کام پر مسلط ہوتا ہے۔

''ملک'' سلطان اور بادشاہ کو کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملک میں قوت و اختیار رکھتا ہے۔

''ملکوت'' کے معنی عزت و سلطنت ہیں۔

''املاک'' بروزن ''اجلاس'' لغت عرب میں بہ معنی تزویج آیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک لفظ ''مملکت'' بھی ہے، جو لغت عرب میں حکومت اور عزت سلطانی کے معنی میں ہے، نیز اس کا اطلاق پانی اور مٹی پر بھی کیا گیا ہے یعنی بادشاہ کے زیر تسلط دریاؤں اور زمینوں کو اس لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

آیات کی جمع آوری و تفسیر

یا اللہ! تو ہی مالک الملک ہے:

(۱) زیر بحث آیات میں سے پہلی آیت کے بارے میں مفسرین نے کہا ہے کہ یہ فتح مکہ کے بعد یا جنگِ احزاب میں خندق کھدائی کے دروان اس وقت نازل ہوئی جب پیغمبر اکرمؐ نے مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں رُوم، ایران اور یمن کے فتح ہونے کی خوش خبری دی منافقین نے اسے حد سے زیادہ بڑا بننے، خیالی پلاؤ پکانے اور ناممکن باتوں کی طمع کرنے کے معنی پہنائے [1]

یہی وہ وقت تھا، جب یہ آیت اُتری، اس نے ان بے خبر لوگوں کو جھنجھوڑا اور بتایا کہ تمام ملکوں کا مالک خدا ہی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: (اے پیغمبر!) کہو کہ اے اللہ تو حکومتوں کا مالک ہے۔ (قلِ اللھم ملك الملك)

تو ہی جسے چاہتا ہے حکومت بخشتا ہے اور جس سے چاہتا ہے حکومت لے لیتا ہے تو جس کو چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے (توتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشآء وتعز من تشاء وتذل من تشاءُ)

نہ صرف حکومت دینا اور لے لینا، عزت و ذلت سے ہم کنار کرنا ہی تیرے اختیار میں ہے۔ بلکہ تمام خوبیاں تیرے سعت قدرت

---

[1] مجمع البیان جلد ۲ صفحہ ۴۲۷۔ تفسیر فخر رازی جلد ۸ صفحہ ۴۔

میں ہیں کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔(بیدك الخیر، انك علی کل شیء قدیر [1])

ہر چیز پر خدا کی قدرت واختیار وحقیقت زمین وآسمان کی وسعتوں پر اس کی حاکمیت کی دلیل ہے ظاہر ہے کہ خدا کے ہر چیز کا مالک ہونے کے دو پہلو ہیں۔یعنی ایک عمومی اور دوسرا حقیقی.....یعنی خدا کا ہر چیز کا مالک ہونا حقیقی ہے اور عمومیت بھی رکھتا ہے لیکن جب دوسروں کے لیے اس کا ذکر کیا ہے تو اس میں جزائی اور مجازی پہلو نمایاں کر دیا ہے۔(توتی الملك من تشآء)

یہ جو بعض مفسرین نے اس آیت کے مفہوم کو محدود کرتے ہوئے اس عہد نبوی کی فتوحات یا مومنین کی عزت اور یہودیوں کی ذلت وغیرہ مراد لی ہے تو اس پر کسی طرح کی دلیل موجود نہیں، کیونکہ یہ آیت بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے اس میں تمام حکومتیں، عزتیں اور ذلتیں شامل ہیں۔البتہ انہوں نے جن امور کا ذکر کیا ہے وہ اس کے واضح مصادیق میں سے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت کا جملہ آخر''(انك علی کل شیء قدیر)خدا کی اس کلی اور مطلق مالکیت پر ایک قوی دلیل ہے۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ اس آیت میں خدا کی جس مشیت واراوہ کا ذکر کیا ہے۔اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ خدا کسی قاعدے قانون کے بغیر ہی عزت دیتا ہے یا ذلت، حکومت عطا کرتا ہے یا واپس لے لیتا ہے بلکہ اس نے عالم اسباب میں فتح وشکست کے لیے عوامل کا ایک سلسلہ قرار دے رکھا ہے۔جو اس کی مشیت وارادہ کے مظاہر ہیں۔

اگر ایک روز مسلمان یورپ کے دروازہ''اندلس'' کو فتح کرتے ہیں یا کسی روز ان کو انہی کی آبادی ہوئی اس سرزمین سے نکال باہر کیا جاتا ہے تو یہ دونوں حالتیں ان اسباب کا نتیجہ جو خدا کی مشیت وارادہ کے مظاہر ہیں۔

پھر اگر یزید اور چنگیز اسے خوں آشام افراد لوگوں پر مسلط ہو جاتے ہیں تو افسوس ہے کہ یہ خود انسانوں ہی کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور وہ ایسی ہی ظالم حکومتوں میں رہنے کے قابل ہوتے ہیں۔جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ ہر قوم کے لیے وہی حکومت مناسب ہے جو اس پر حکمرانی کر رہی ہو۔

اس سے ان بہت سے سوالوں کا جواب مل جاتا ہے، جو اس آیت کے بارے میں اٹھائے جاتے ہیں۔لہٰذا کسی مزید توضیح کی حاجت نہیں ہے۔

(۲) دوسری آیت میں تحویل قبلہ پر یہودیوں کے اس بودے اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔انہوں نے کہا تھا: آیا خدا ایک حکم کو منسوخ کر کے اس کی بجائے دوسرا حکم جاری کر سکتا ہے کہ حکم قبلہ کو بیت المقدس سے ہٹائے اور کعبہ کے لیے نا قد کر دے؟ اس بارے میں فرماتا ہے: آیا تمہیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کا مالک خدا ہے؟(الم تعلم ان اللہ لہ ملك السمٰوٰت والارض)

اس صورت میں آیا یہ تعجب کی بات ہے کہ ایسا عالی قدر حاکم کسی حکم کو منسوخ کر دے؟ وہ نہ فقط اپنے بندوں کے مصالح ومنافع سے آگاہ ہے، بلکہ حاکمیت بھی خاص اسی کے لیے ہے اور وہ امور عالم کی تدبیر اور اس میں تصرف کرنے کا مختار مطلق اور بندوں کا مالک

---

[1] بعض ماہرین لغت کا خیال ہے کہ''خیر واختیار'' کا مادہ ایک ہی ہے اسی لیے خوبیوں کو''خیر'' کہتے ہیں۔کہ ہر شخص ان کو پسند کرتا اور انہیں حاصل کرنا چاہتا ہے(التحقیق، المفردات، تفسیر المیزان میں آیت زیرِ بحث کے ذیل میں ملاحظہ کریں)

ہے۔اسی لیے آیت کے آخر میں مزید فرماتا ہے۔خدا کے علاوہ تمہارا کوئی سرپرست و مددگار نہیں ہے(وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر)۔

وہ اپنے کامل وآگاہی کے ذریعے مصالح ومفاسد میں تمہاری مدد کرتا اور اپنی حاکمیت کی بدولت تمہارے لیے قانون بناتا ہے۔

علاوہ ازیں خدا کسی مقام ومکان سے بے نیاز ہے اور اس کے لیے کوئی خاص سمت قرار نہیں دی جاسکتی کہ نماز کے دوران ادھر رُخ کیا جائے۔اس لحاظ سے بطور قبلہ ایک مقام کا تعین صرف اسی لیے ہے کہ یہ اس کا حکم ہے کیونکہ وہ سارے جہان کا ملک ہے۔

خدا کے لیے''ولی ونصیر'' کے صفات قرآن میں بہت سے مواقع پر مذکور ہیں۔ممکن ہے ان میں دو جہتوں سے تفاوت وفرق ہو:

(۱)''ولی'' کے معنی فوائد ومنافع کی حفاظت کرنے والا ہیں اور''نصیر'' وہ ہے جو دُشمن کے مقابلے میں انسان کی مدد کرے۔

(۲) ''ولی'' وہ ہے جو اس کے لیے شخصاً کوئی کام کرے جو اس کی ولایت کے تحت ہو،لیکن''نصیر'' وہ ہے جو انسان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنی مشکل کو دور کرسکے۔

(۳) انسانوں اور جانوروں کی خلقت وآفرینش اور ان میں ہونے والی عجیب وغریب تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے تیسری آیت میں فرماتا ہے:وہی خدا تمہارا پروردگار ہے(عالمِ ہستی کی)حکومت اسی کے لیے ہے۔(ذلکم اللہ ربکم لہ الملك)۔

وہ خالق بھی ہے اور مربی بھی،نیز اسی وجہ سے مالک وحاکم بھی ہے،اب اس بیان کو توحید عبادت کی بنیاد قرار دیتے ہوئے فرمارہا ہے۔اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں،پھر کیوں تم راہ حق سے منحرف ہورہے ہو؟(لاالہ الاھو فانی تصرفون)۔

اے بے خبر غافلو!اور اے وادی ضلالت وگمراہی میں بھٹکنے والو!! خدا کی خالقیت،ربوبیت اور مالکیت کی ان تمام روشن دلیلوں کے باوجود کیوں تم بے راہ ہوئے جارہے ہیں۔

دراصل زیرِ بحث آیت کے اس حصے میں خدا کی توحید حاکمیت''کو بنیاد بنا کر''توحید عبادت'' کا اثبات کیا جارہا ہے اور اس کی حاکمیت کو مسئلہ خلقت وآفرینش کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے کیونکہ مشرکین بھی تسلیم کرتے تھے کہ اس دنیا جہان کا خالق اور اسے پیدا کرنے والا وہ خدائے واحد ہی ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں طالوت وجالوت کی داستان پر نظر کی گئی ہے۔جالوت ایک ظالم وجابر شخص ہے جو بنی اسرائیل پر حکومت کررہا تھا۔اور اس نے انہیں بری طرح دبا رکھا تھا۔اس زمانے کے پیغمبر''اشموئیل[1] نے بنی اسرائیل کی درخواست پر ایک غریب کسان کے بیٹے طالوت کو ان کا سپہ سالار اور حکمران منتخب کیا تو اسرائیلی سردار اس انتخاب پر معترض ہوئے وہ سردار زادے اور سرمایہ دار ہونے کے باعث طالوت کی نسبت خود کو اس منصب کے زیادہ حق دار سمجھتے تھے۔تاہم ان بزرگ پیغمبر نے ان لوگوں کی اس غلطی فہمی کو دور کرنے کے لیے بڑی صراحت کے ساتھ کہا:وہ علم وآگاہی اور جسمانی قوت کے لحاظ سے تم پر فوقیت رکھتا ہے۔

---

[1] بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ پیغمبر شمعون یا یوشع تھے،لیکن یہ قول بیف بعید ہے،اور پھر یوشع تو اس زمانے میں ہو ہی نہیں سکتے،کیونکہ وہ حضرت موسیٰؑ کے وزیر تھے۔

اس کے بعد فرمایا: خدا اپنا ملک جسے چاہے بخش دیتا ہے (واللہ یوتی ملکہ من یشآءُ)

اس کے ساتھ ہی واضح کر دیا۔ خدا (احسان کرنے میں) وسعت رکھتا ہے۔ اور وہ افراد کی لیاقت برائے منصب سے) آگاہی رکھنے والا ہے (واللہ واسع علیم)

گویا خدا تعالیٰ اس جہان پر نہ صرف تکوینی حاکمیت رکھتا ہے، بلکہ انسانی معاشرے پر تشریعی وقانونی حکومت بھی اسی کی طرف سے ہے اور وہ جسے چاہتا ہے حکومت عطا کر دیتا ہے اگرچہ اس کا یہ چاہنا اور ارادہ کرنا افراد کی اہلیتوں اور لیاقتوں کی بناء پر ہوتا ہے۔

(۵) پانچویں آیت میں یہی مسئلہ ایک اور انداز سے ذکر ہوا ہے اس میں سورج، چاند اور نور وظلمت کے نظام پر خدا کی حاکمیت کے بیان سے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا: وہ اللہ تمہارا پروردگار ہے۔ (ذٰلکم اللہ ربکم)

(سارے جہان کی) حکومت اسی کے لیے ہے۔ (لہ الملك)

اور اس کے سوا جن (معبودوں) کو تم پکارتے ہو وہ تو کھجور کی گٹھلی کی نازک جھلی کے بھی مالک نہیں ہیں۔

(والذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیرٍ)

مفسرین اور ماہرینِ لغت نے ''قطمیر'' کے کئی معانی بیان کیے ہیں، لیکن اس کا معروف تر معنی وہ جھلی ہے جو کھجور کے گودے اور گٹھلی کے درمیان ہوتی ہے۔

بعض نے اسے اس چھوٹے سے سفید داغ کے معنی میں لیا ہے جو کھجور کی گٹھلی کی پشت پر ہوتا ہے کہ وہ یہیں سے اُگتی اور درخت کی شکل اختیار کرتی ہے۔

بعض نے اس سے دانہ خرما کے اوپر کا باریک چھلکا مراد لیا ہے کچھ لوگوں نے اس کو گٹھلی کے درمیانی شگاف کے معنی پہنائے ہیں اور بعض نے اسے وہ زندہ مادہ قرار دیا ہے جو گٹھلی کے اندر ہوتا ہے۔

بہرحال یہ پانچویں معنی کھجور کی گٹھلی سے ہی تعلق رکھتے ہیں جو ہمیشہ سے عربوں کی نظروں کے سامنے رہی ہے بعض تفسیروں میں قطمیر کے معنی پیاز کا چھلکا بھی کیے گئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اس سے قبل واضح کیا ہے اس کے پہلے معنی ہی زیادہ مشہور اور معروف ہیں۔ اندریں صورت ان میں سے جو معنی بھی مراد لیا جائے وہ ایک بے اہمیت، کم قیمت اور حقیر چیز کی طرف کنایہ ہے یعنی مشرکوں کے خود ساختہ معبود کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کے بھی مالک نہیں ہیں۔ [1]

مذکورہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خداوند عالم کے علاوہ کسی کے لیے کوئی مالکیت وحاکمیت نہیں ہے۔ مگر یہ کہ وہ اپنی مشیت کے تحت کسی کو عارضی حکومت عطا کر دے۔

(۶) چھٹی اور آخری آیت میں بھی اسی مطلب کو ایک نئی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ رُوئے سخن پیغمبر اکرمؐ کی طرف کرتے

---

[1] تفسیر مجمع البیان۔ تفسیر روح المعانی۔ تفسیر قرطبی تفسیر المیزان۔ تفسیر مراغی۔ المرادت راغب وغیرہم۔

ہوئے فرمایا گیا: (اے پیغمبران مشرکوں سے) کہو کہ جن کو بزعم خویش تم پکارتے ہو (وہ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتے) (قل ادعو الذین زعمتم من دون اللہ)

پھر بتایا ہے کہ یہ اس لیے تمہاری کوئی مشکل حل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ انہیں آسمانوں اور زمین میں ایک ذرہ برابر اختیار نہیں (لایملکون مثقال ذرۃٍ فی السمٰوٰت ولا فی الارض) نہ وہ ان کی خلقت میں شریک ہیں اور نہ وہ اس میں خدا کے مددگار ہیں (ومالھم فیھما من شرکٍ ومالہ منھم من ظھیرٍ)۔

اس لحاظ سے نہ وہ زمین اور آسمانوں کے مستقل مالک ہیں نہ مالکیت میں شریک ہیں اور نہ مددگار.....اندریں حال ان کا وہ کونسا کارنامہ ہے کہ جس کے پیشِ نظر تم ان کے سامنے جھکتے اور ان کی عبادت کرتے ہو؟ ان ظاہری دلیلوں کے ساتھ قرآن اس جہان ہستی کی مالکیت وحاکمیت میں خدا کے ساتھ کسی کی شرکت کی نفی کرتا ہے یعنی کسی اور کی مستقل مالکیت وحاکمیت یا اس میں شریک ہونے یا مددگار ہونے کی تردید کرتے ہوئے اسے خاص خدا کے لیے قرار دیتا اور اسے ہر قسم کے شریک و مددگار سے منزہ و پاک شمار کرتا ہے۔

مذکورہ بالا چھ آیات اور ایسی ہی دیگر آیاتِ قرآن سے مجموعی طور پر ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ کسی موحد کامل کے نقطہ نظر سے اس جہانِ ہستی میں خدائے تعالیٰ کے سوا کوئی مالک وحاکم وجود نہیں رکھتا۔ اگر کوئی شخص کسی مقام ومنصب پر فائز ہے تو بھی وہ ایک ذرہ خاک تک کا مالک نہیں ہوتا، اس کے حالت میں مشرکوں کے لیے بتوں۔ اربابِ انواع یا فرشتوں اور ایسی ہی کسی دوسری مخلوق کی عبادت کرنے کا کوئی عذر و بہانہ باقی نہیں رہتا۔

توضیحات

(۱) توحید مالکیت وحاکمیت پر ایمان کے تربیتی اثرات:

انسان میں طغیانی، سرکشی وتکبر اور بخل وحسد کے پیدا ہونے کا سبب ہمیشہ اس کا یہ خیال خام ہوتا ہے کہ وہ اموال واشیاء کا حقیقی مالک ہے یا ایک چھوٹے بڑے علاقے کی حکومت اس کے ہاتھ آجائے تو وہ خود کو مطلق العنان سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی وہ شرک آلود نظریہ ہے جو معاشرہ میں مختلف قسم کے گناہوں اور خرابیوں کے پیدا ہونے اور ان میں اضافے کا موجب ہے۔

لیکن جس وقت اس دنیا کو توحید کے آئینے میں دیکھا جائے اور آیاتِ بالا کے مطابق اسے بلاشرکت غیرے خداوند تعالیٰ کی ملکیت تصور کر لیا جائے تو پھر انسان خود کو مالک نہیں امانت دار سمجھنے لگتا ہے۔ جیسا کہ سورۂ حدید آیت، میں آیا ہے اس مال میں سے خدا کی راہ میں خرچ کرو جس میں اس نے تمہیں اپنا نمائندہ وجانشین بنایا ہے۔ (وانفقو مما جعلکم مستخلفین فیہ۔ اگر انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ خود کو امانت دارِ الٰہی تسلیم کرے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اس امانت کے اصل مالک کے حکم پر عمل کرنے میں کوتاہی کرے یا حسد اور بخل میں مبتلا ہو جائے۔

اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس امانت کے اصل مالک کے حکم پر عمل کرنے میں کوتاہی کرے یا حس اور بخل

میں مبتلا ہو جائے۔

اس صورت میں یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس دنیا کے اموال انسان کی سرکشی اور تکبر کا سبب بن جائیں کیونکہ یہ سب کچھ خدا کا ہے اور وہی ہر چیز کا مالک اصلی ہے۔ آیا ایک بنک آفیسر ان لاکھوں روپئوں پر مغرور ہوسکتا ہے جو روزانہ اس کے ہاتھوں میں آتے ہیں؟

یہی حال ان حکومتوں اور منصوبوں کا ہے جو افراد کو ملے ہوئے ہیں، ان کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اس عالمِ ہستی میں ایک چھوٹے سے حصے پر خدائے تعالیٰ کے نمائندہ اور اس کے امانت دار ہیں اس چیز کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے غرور اور سرکشی کے کیا معنی؟ اور اس صورت میں انسان کیونکر ظلم اور فساد پر آمادہ ہوسکتا ہے؟

یہ توحیدنظر اور الٰہی جہاں بینی انسان کو ایک اور ہی رنگ میں رنگ دیتی ہے وہ وہی خدائی رنگ (صبغۃ اللہ) ہے کہ جس سے انسان کی سیرت و کردار پر صلح پسندی، صاف باطنی، امن دوستی اور اتفاق و ایثار کے نقوش اُبھر آتے ہیں۔

(۲) خدائی مالکیت سے غلط استفادہ:

اس میں شک نہیں اور جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے۔ خدا تمام جہانِ ہستی کا مالک ہے۔ نہ صرف بہت سی آیاتِ قرآن اس بات کو ثابت کرتی ہیں، بلکہ متعدد عقلی دلائل بھی ہے اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ کیونکہ اس کی ذاتِ مقدس پر واجب الوجود ہونے کا انحصار اور تمام موجودات کے اس کی بارگاہ میں محتاج و نیازمند ہونے سے ان سب پر اس کی مالکیت پوری طرح ثابت ہوتی ہے۔

لیکن یہ چیز افراد انسانی کی اس محدود اور قانونی مالکیت کے منافی نہیں ہے جس کی اجازت خدا نے دے رکھی ہے جن لوگوں نے اس خدائی مالکیت کو بہانہ بنا کر ہر قسم کی ''خصوصی مالکیت'' کی نفی کی ہے یہ دے رکھی ہے جن لوگوں نے اس خدائی مالکیت کو بہانہ بنا کر ہر قسم کی ''خصوصی مالکیت'' کی نفی کی ہے یہ اس مسئلے سے غلط فائدہ اٹھانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ کبھی کبھی اسے اسلامی فکر قرار دیا جاتا ہے اور اس ناطے سوشلزم و کمیونزم کو اسلام کے ہم رنگ ثابت کرنے کی ناکام کوشش بھی کی جاتی ہے اس کے جواب میں ہم کھل کر کہنا چاہتے ہیں کہ جو قرآن خداوند عالم کے اس جہان کا مالک ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ اسی قرآن میں ''وراثت'' ''خمس'' ''زکات'' ''تجارت'' سے متعلق آیات بھی موجود ہیں اور اموال کے ''مالکان خصوصی'' کی مالکیت کو قانونی طور پر تسلیم کرتا ہے۔

قرآن کی چودہ آیتوں میں ''اموالکم'' (تمہارے اموال) اور اکتیس آیتوں میں ''اموالھم'' (ان کے اموال) کے الفاظ آئے ہیں اسی طرح بہت سی قرآنی آیات میں مسلمانوں کو ان کے اموال کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں اگر خدائی مالکیت اپنے مفہوم میں انسانی مالکیت کے منافی ہو تو پھر ان پینتالیس آیتوں میں جو الفاظ آئے ہیں (اور دیگر کئی آیات میں بھی ہیں) وہ کیا معنی رکھتے ہیں؟

قرآن ایک مقام پر کہتا ہے: تم یتیموں کے اموال نہ کھاؤ (نساء ۲، ۱۰)

دوسری جگہ کہا گیا ہے۔ جو لوگ اپنا مال راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، انہیں ایسی ایسی جزاء ملے گی (بقرہ۔ ۲۶۲)

سودخوروں کے بارے میں ارشاد ہوا: اگر سودخوری ترک کردو تو تم اپنے اصل سرمائے کے مالک ہوگے۔ (بقرہ۔ ۲۷۹)

قرآن یہ بھی کہتا ہے: جب یتیم سن رشد کو پہنچ جائیں تو ان کا مال انہیں دے دو (نساء۔٦)

قرآن میں ایسی اور تعبیرات بھی ہیں جو انسانی مالکیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

البتہ اسلام میں اسی خصوصی مالکیت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں۔ جیسے مالکیت عمومی'' اور مالکیت دولت یعنی عوامی مالکیت اور سرکاری مالکیت کہ قرآن میں ان کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔لیکن ان میں سے کوئی ایک بھی خدائی مالکیت سے اختلاف نہیں رکھتی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ توحیدِ مالکیت''اس سے مانع نہیں کہ ہر فرد انسانی یا معاشرے کا ایک گروہ خاص یا خود معاشرہ شرعاً کچھ چیزوں کا مالک ہوتا ہم ان مالکیتوں کے لیے مقررہ شرائط واحکام ہیں جو فقہ اسلامی میں مدون شکل میں موجود ہیں۔

(۴) توحید قانُون گذار یحاکمیت تشریعی

اشارہ:

ہم جانتے ہیں کہ معاشروں کے نظم وضبط کے لیے تین قوتوں کی ضرورت ہے:

(۱) قوت قانونگذاری.....اس کا کام ایسے قوانین وضع کرنا ہے کہ جن سے معاشرے کے نظام کی حفاظت ہو سکے اور کسی فرد یا گروہ کے حقوق تلف نہ ہونے پائیں۔

(۲) قوت مجریہ..... یہ ایسی قوت جو قوت ہے قانون گذاری کے بنائے ہوئے قوانین کا نفاذ واجراء کرتی ہے اس میں عموماً حکومت، وزارتیں اور مختلف ادارے ومحکمے شامل ہوتے ہیں۔

(۳) قوت قضائیہ.....اس کا کام قانون کے خلاف چلنے والوں کو سزا دینا اور راہ راست پر لانا ہے۔ توحیدِ اسلام کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان تینوں قوتوں کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے اور اس کے فرمان کے بغیر کسی کو ان میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ کیونکہ وہی ذات قانون ساز ہے، وہی حکومت کرنے کا اذن واجازت دے سکتی ہے اور وہی ذات ہے جس نے قضاوت کو نظام بخشا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ یہ تینوں قوتیں خدا کے اذن سے اپنی مشروعیت اور اس کے حکم سے اپنے حدود وقواعد اخذ کریں، اگرچہ اس کے لیے بہت سے عقلی دلائل موجود ہیں، تاہم قرآن مجید میں بھی اس کا تفصیلی تذکرہ ہوا ہے۔ اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کی طرف رجوع کرتے اور آیاتِ ذیل پر نگاہ ڈالتے ہیں۔

(۱) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۴۴ ﴿المائدۃ: ۴۴﴾

(۲) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۴۵ [۵:۴۵]

(۳) وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۴۷ [۵:۴۷]

(۴) وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ

(۵) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۶۵ [۴:۶۵]

(۶) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ○ (انعام۔ ۵۷، یوسف علیہ السلام ۴۰،۶۷)

(۷)وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ [۲۸:۷۰]

(۸) وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ؕ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ [۲۸:۸۸]

(۹)وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبِّيْ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۾ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ۝ [۴۲:۱۰]

(۱۰) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ [۶:۱۱۵] [1]

ترجمہ:

(۱) جولوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

(۲) جولوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ظالم ہیں۔

(۳) جولوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ فاسق ہیں۔

(۴)(اہل کتاب) کے درمیان خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ کرواوران کی خواہشات کی پیروی نہ کرو،ان سے بچ کررہوکہ کہیں وہ تم کوخدا کے بعداحکام سے منحرف نہ کردیں جوتم پرنازل ہوئے ہیں۔

(۵) تمہارے پروردگار کی قسم کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے،حتیٰ کہ اپنے اختلاف میں تمہیں منصف بنائیں۔پھرتمہارے فیصلے پراپنے دلوں میں کچھ تنگی محسوس نہ کریں اوراس کو پورے طور پرتسلیم کرلیں۔

(۶) حکم وفیصلہ صرف خداہی کے اختیار میں ہے.....

---

[1] قرآن میں اسی مضمون کی دیگرآیات بھی ہیں۔جیسے آیت ۴۸،۵۰۔مائدہ ۲۶۔کہف،۸۷۔اعراف،۱۰۹،یوسف ۴۵،ہود ۸۰، یوسف ۸۰، تین:۶۰۔نساء

(۷) وہ اللہ ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں دنیا میں اور آخرت میں، حاکمیت بھی اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(۸) اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو، کیونکہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کی ذات کے علاوہ تمام چیزیں فنا ہو جانے والی ہیں۔ حاکمیت صرف اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(۹) جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو، اس کا فیصلہ صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے وہی خدا میرا پروردگار ہے میں اسی پر بھروسہ کیے رہتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

(۱۰) کیا میں سوائے خدا کے کسی کو اپنا منصف بناؤں، حالانکہ وہی تو ہے، جس نے تمہارے لیے یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے۔ جس میں ہر چیز کا ذکر ہے۔

مفردات کی تشریح:

''حکم'' بروزن ''قفل'' ہے۔ بہت سے ماہرین لغت کے نزدیک اس کے اصل معنی منع کرنا اور روکنا ہیں[1] بعد میں اس کو ''قضاوت'' اور ''حکومت'' کے لیے استعمال کیا جانے لگا، کیونکہ قاضی اور حاکم اپنے قطعی حکم کے ذریعے لوگوں کو اس حکم کی مخالفت یا دیگر ناجائز کاموں سے باز رکھتا ہے۔

حکمۃ ''بروزن'' غلبۃ'' کا معنی لوہے کا وہ حلقہ یا کیل ہے جو لگام یا نکیل میں حیوان کے منہ یا اس کی ناک میں ڈالتے ہیں۔ جب اسے کھینچا جائے تو حیوان کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ مطیع ہو جاتا ہے تاہم اس میں بھی منع اور روکنے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

لسان العرب کے مولف کا کہنا ہے کہ ''حکم'' کے کئی معانی ہیں۔ جیسے علم وفہم اور حق وعدالت کے مطابق فیصلہ دینا (اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امور انسان کو ناجائز کام سے باز رکھتے ہیں)

حکیم کو اس لیے حکم کہتے ہیں کہ وہ بہت زیادہ علم وآگاہی رکھتا ہے جو اسے گناہوں، نادرست کاموں اور غلطیوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ لفظ (حکم) تینوں معنوں یعنی ''قانون گذاری'' ''قضاوت'' اور ''امور اجرائی'' میں استعمال ہوتا ہے اور ان ہر سہ فرائض میں سے ہر ایک کے ذمہ دار کو ''حاکم'' کہا جاتا ہے۔ اسی لیے بعض کتب لغت میں ''حکم'' کے معنی تفویض اور ایک کام کسی دوسرے کے سپرد کرنا بھی ہیں۔

---

[1] المفردات راغب، مقاییس اللغۃ۔ مصباح المنیر قیومی۔

کتاب ''العین'' مین آیا ہے کہ ''حکمت'' کے لفظ میں علم، عدالت اور حلم کے معنی پائے جاتے ہیں۔ پھر آگے چل کر لکھتا ہے کہ حکمت کے معنی کرنا ہے یا فساد سے منع کرنا بھی ہیں اور یہ تشریح ان تمام اہل لغت کے بیانات سے مطابقت رکھتی ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

''آیات محکمات'' کو اس لیے محکمات کہا گیا ہے کہ ان کی صراحت اور واضح دلالت ہر قسم کی نادرست تفسیر اور تاویل کا راستہ روک دیتی ہے۔

آیات کی جمع آوری اور تفسیر

(۱) تا (۴) سورۂ مائدہ کی چار آیات (۴۴۔۴۵۔۴۹) میں مسئلۂ توحید حاکمیت بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفسیر میں ان سے قریب تر آیات بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تفسیر میں ان سے قریب تر آیات ۴۸، ۵۰ بطور ضمیمہ ذکر ہوئی ہیں۔

پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے: جو لوگ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ دوسری آیت میں کہا کہ وہ ظالم ہیں اور تیسری آیت میں ہے کہ وہ فاسق ہیں (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فائولك ھم الکافرون۔ ھم الظلمون... ھم الفسقون)۔

ان تینوں تعبیرات کے مفاہیم مختلف ہیں یا سب ایک مفہوم کی طرف اشارہ کررہی ہیں۔ اس بارے میں مفسرین نے بہت کچھ بحث کی ہے، بعض کا نظریہ ہے کہ یہاں ایک ہی گروہ کا ذکر ہے۔ جس میں متعدد صفات پائی جاتی ہیں اس کی تفسیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ جو بھی شخص ما انزل اللہ (جو بھی خدا نے نازل فرمایا) کے خلاف حکم وفیصلہ کرے گا۔ چونکہ وہ خدا کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا ہے اس لیے کافر ہے۔ اس لیے کہ حقوق انسانی کی تلف کررہا ہے وہ ظالم ہے اور اس کی وجہ سے کہ خدا کے مقرر کردہ حدود سے خارج ہو رہا ہے وہ فاسق ہے (یاد رہے کہ فسق کا مطلب وظیفہ بندگی کو ترک کردینا ہے)۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ پہلی اور دوسری آیت یہودیوں کے متعلق اور تیسری آیت مسیحیوں کے متعلق ہے۔ چونکہ یہودیوں کی احکام الٰہی کے ساتھ دشمنی مسیحیوں سے بڑھ کر ہے۔ لہٰذا وہ کافر وظالم ہیں اور فقط فاسق ہیں۔

بہر حال یہ ایک واضح امر ہے کہ آیات کا کسی مورد خاص میں نزول ان کے مفہوم کو خاص اور محدود نہیں کرتا اس لیے یہ آیات ان سب افراد اور گروہوں پر صادق آتی ہیں جو احکام الٰہی کے خلاف حکم وفیصلہ دیتے ہیں۔

جو بھی شخص فرمان الٰہی کے خلاف حکم دے گا اس کا ظالم وفاسق ہونا ثابت ہے البتہ کفر کا اطلاق اس صورت میں ہوگا کہ وہ حکم خدا کو رد کرے اور اسے باطل سمجھے۔ کیونکہ ایسا قول یا اعتقاد خدا کی ذات کا انکار یا اس کے علم حکمت اور یہ قطعی طور پر کفر ہے۔ اسی طرح کسی حکم نے انکار سے انکار رسالت محمدیہ لازم آئے تو یہ بھی کفر میں داخل ہے۔

لیکن اگر ایک شخص حکم الٰہی کے خلاف فیصلہ کرے اور اس کی بنیاد خواہش نفس پر ہو یعنی وہ توحید ونبوت کا انکار نہ کرتا ہو تو اس پر کفر لازم نہیں آئے گا۔

اس سورے کی آیت ۴۸ میں بھی یہی حکم آیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا (فاحکم بینھم بما انزل اللہ) خدا کے احکام کے مطابق ان کے درمیان حکم خدا کے مطابق کرو۔ نیز اس کے ساتھ ہی آیت ۴۹ میں ہے (وان احکم بینھم بما انزل اللہ) لازم ہے کہ ان کے درمیان حکم خدا کے مطابق کرو۔

اس سے اگلی آیت ۵۰ میں فرمایا (فحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکماً لقومٍ یوقنون) کیا وہ تم سے جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، باایمان افراد کے لیے خدا کے سوا کون بہتر فیصلہ کرنے والا ہوگا؟

ان چھ آیتوں میں سے اس بات کی تاکید در تاکید ہوئی ہے کہ حقیقی حکم بس خدا ہی کا حکم ہے۔

ایک ہی سورے کی چھ آیتوں میں پے در پے مختلف عبارتوں میں حق حکم کو خاص خدا ہی کے لیے قرار دیا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی بڑے سے بڑے عہدیدار اور بلند سے بلند منصب رکھنے والے کو قانون سازی کا حق نہیں ہے، بلکہ یہ صرف اور صرف خدا کا حق ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے لیے قانون بنائے، پس جو شخص خدا کے حکم کے خلاف فتویٰ دے یا فیصلہ کرے یا حکومت کرے، تو وہ بہت بڑے گناہ کا مرتکب ہوگا اور اسے ظالم وستم گار شمار کیا جائے گا۔ یہ ایک ایسا گناہ ہے جو اس کے بدن سے لباس ایمان اتار لے گا۔

اس ترتیب سے توحید وحاکمیت تشریعی اور حق قانون سازی کا خداوند حاکم کی ذاتِ مقدس میں منحصر ہونا نیز حکم کا حکم خدا میں انحصار پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے۔

(۵) پانچویں آیت میں منصب قضاوت پر بات ہو رہی ہے۔ اسے پیغمبر اکرمؐ (اور ان کی طرف سے امامت مطلقہ یا خصوصی قضاوت پر نصب کیے گئے افراد) کے لیے دیتے ہوئے فرماتا ہے۔

تمہارے پروردگار کی قسم کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے حتیٰ کہ اپنے اختلاف میں تمہیں منصف بنائیں (فلا وربك لایومنون حتیٰ یحکموك فیما شجر بینھم)۔

پھر تمہارے فیصلے پر اپنے دلوں میں کچھ تنگی محسوس نہ کریں۔ (ثم لایجدوا فی انفسھم حرجاً مما قضیت)

اور اس کو پورے طور پر تسلیم کرلیں (ویسلموا تسلیماً)

بنابریں ایمانِ خالص کی یہ تین علامات ہیں۔

(۱) اپنے تمام اختلافات میں پیغمبر اکرمؐ کو حکم وفیصلہ کنندہ قرار دینا۔

(۲) پیغمبرؐ جو حکم یا فیصلہ صادر فرمائیں اس پر کوئی ناخوشی یا تنگی محسوس نہ کرنا۔

(۳) حضور اکرمؐ کے حکم پر بہ تمام وکمال عمل درآمد کرنا۔

اس ترتیب سے یہ آیت حاکمیت کے دوسرے شعبے یعنی حاکمیت قضاوت کو بھی خداوند تعالیٰ کے لیے قرار دیتی ہے (کیونکہ نبی اکرمؐ خدا کے نمایندہ اور اس کی طرف سے مامور ہیں)۔

حکم بس اللہ ہی کا ہے:

(۶) چھٹی آیت میں ایک مختصر جملے میں فرماتا ہے (حکم وفیصلہ صرف خدا ہی کے اختیار میں ہے ان الحکم الا للہ۔

البتہ خود یہ جملہ کہ جو قرآن میں کئی بار دوہرایا گیا ہے بڑا وسیع مفہوم رکھتا ہے اور حکم بہ معنی قانون گذاری (قانون سازی) بھی اس میں شامل ہے نیز حکومت وقضاوت اور حکم تکوینی وتشریعی سبھی اس کے تحت آجاتے ہیں۔لیکن اس میں ایک اور پہلو بھی زیرنگاہ رکھنا چاہئے کہ سورۂ انعام آیت ۵۷ اور سورۂ یوسفؑ آیت ۶۷ میں جملہ کافروں کے لیے عذاب و پاداش کے ضمن میں حکم خا کے اجراء کو بیان کررہا ہے۔

بہرحال حکم بس اللہ ہی کے لیے ہونے کی تعبیر کا مختلف موارد میں استعمال جیسے ہم نے پہلے بھی کہا ہے۔اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ آیت بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے۔اور ہر قسم کے حکم فرمان کو خدا کے لیے مخصوص ٹھیراتی ہے، اس میں عالم تکوین اور عالم تشریع سے متعلق تمام احکام شامل وداخل ہیں۔

(۷) ساتویں آیت میں خدا کو دنیا وآخرت میں لائق عبادت اور قابلِ حمد وثنا قرار دینے کے بعد فرماتا ہے وہ اللہ ہے کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب تعریفیں اسی کے لیے ہیں اس دنیا میں اور آخرت میں، حاکمیت بھی اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔

(وھو اللہ الا الہ الا ھو لہ الحمد فی الاولیٰ والاخرۃ ولہ الحکم ولیہ ترجعون)۔

''ولہ الحکم'' ہر دو عالم میں حاکم وہی ہے یہ جملہ درحقیقت صرف اسی کے حمد وستائش اور عبادت و پرستش کے لائق ہونے کی دلیل کا درجہ رکھتا ہے، کیونکہ ''معبود'' اور ''محمود'' وہ ہے جس کا حکم ہر چیز میں جاری ونافذ ہو اگرچہ بعض مفسرین مثلاً ابنِ عباس نے کہا ہے کہ یہاں ''حکم'' سے مراد قیامت میں اس کا بندوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے [۱]

لیکن اس آیت کے مفہوم کو محدود کرنے کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔اور پھر ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ کسی آیت کے سبب نزول کی خصوصیت اس کے معنی ومطلب کی عمومیت میں مانع نہیں ہوتی۔

لہٰذا مذکورہ بالا آیت عالمِ تکوین اور عالمِ تشریع میں خدائے تعالیٰ کی توحید وحاکمیت اور قانون سازی وقضاوت کے حق کو ثابت کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ ان امور میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔چنانچہ تفسیر المیزان میں بھی اس آیت کے مفہوم میں عمومیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔[۲]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جملہ ''لہ الحکم'' دو جہتوں سے حصر پر دلالت کرتا ہے، اوّل یہ کہ ''لہ'' کو مقدم کیا گیا اور دوم یہ کہ ''الحکم'' مطلق صورت میں آیا ہے۔یعنی اس میں ہر قسم کی حکومت شامل ہے۔

یاد رہے کہ خدائے تعالیٰ کی یہ کلی حاکمیت اس سے مانع نہیں ہے کہ وہ اختیار حکومت پیغمبروں، معصوم اماموں یا اپنے دیگر صالح بندوں

---

[۱] تفسیر روح المعانی جلد ۲۰ صفحہ ۹۲۔

[۲] تفسیر المیزان جلد ۱۶ صفحہ ۷۰۔

کوعطاء کردے، جیسا کہ حمد وستائش کا اسی کے لیے مخصوص ہونا اس سے مانع نہیں ہے کہ انسان ان صالح بندوں کا جو حصول نعمت کا وسیلہ ہیں یا ماں باپ اور استاد کی توصیف کرے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ دراصل یہ سب تعریفیں خدا ہی کی ہیں اور یہی ہے توحید حاکمیت کا مفہوم ومطلب!

(۸) آٹھویں آیت میں پہلے توحید عبادت کا ذکر کیا اور پھر توحید حاکمیت کے بارے میں فرماتا ہے: اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارو کیوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں (ولا تدع مع الله الٰهاً اٰخر لا اله الا هو)۔

اس سے اگلا جملہ کہ جو اس حکم کی دلیل کی حیثیت رکھتا ہے، اس میں فرمارہا ہے اس کی ذات کے سوا تمام چیزیں فنا ہوجانے والی ہیں (کل شیء هالك الا وجه)۔

پھر آخر میں فرماتا ہے: حاکمیت صرف اسی کے لیے ہے اور تم اسی کی طرف پلٹ جاؤ گے۔ (له الحکم و الیه ترجعون)۔

یہ آیت عبادت، بقاء اور حکم وفیصلہ کو خدا کے لیے مخصوص شمار کرتی ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں ''حکم'' کو خدا کے حکم تکوینی اور اس ارادہ کے معنی میں لیا ہے جو ہر چیز میں کارفرما ہے بعض نے اسے قیامت میں فیصلہ کرنے اور بعض نے اس کو فقط حکم تشریعی سے متعلق قرار دیا ہے۔ الفاظ بتارہے ہیں۔ کہ یہ آیت مطلق اور بے قید وشرط ہے لہٰذا اس میں عالم ہستی اور عالمِ شریعت نیز اس دنیا اور دوسری دنیا کے بارے میں ہر حکم شامل ہوجاتا ہے۔

جملہ ''کل شیء هالك الا وجهه'' میں لفظ ''وجہ'' سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسروں نے اس کی تشریح ان اعمالِ صالح سے کی ہے جو خدا کے ارادہ کے تحت انجام دیئے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ خدا کا دین وآئین ہے اور بعض نے اس کی تفسیر خدا کے مقام ومرتبہ کے طور پر کی ہے۔

لیکن ہم جانتے ہیں کہ ''وجہ'' دراصل ''چہرہ'' کے معنی میں ہے پر ھ اس لیے کہ بقول راغب اصفہانی ''چہرہ'' وہ پہلی چیز ہے جو کسی دوسروں سے جدا کر کے دکھاتی ہے اور یہ برترین عضوِ بدن ہے، اس لفظ کا اطلاق اعلیٰ اور برتر موجودات پر کیا جاتا ہے۔ اور اسی مناسبت ہے یہ خدا کی ذاتِ مقدس کے لیے استعمال ہوا ہے نیز اس آیت میں بھی ظاہراً اس کے یہی معنی مراد ہیں۔

لیکن اس لحاظ سے کہ ہر وہ موجود ومخلوق جو اس باقی وابدی ذات سے رابطہ پیدا کرلے وہ بھی ابدیت کا رنگ اختیار کرلیتی ہے، لہٰذا خدا کا دین وآئین اس کے حکم سے انجام دیئے گئے اعمال اور پیغمبران الٰہی کو جو اس سے رابطہ رکھتے ہیں وہ سبھی بقاء اور ابدیت سے ہم کنار ہوجاتے ہیں..... اسی ترتیب سے آیت زیر بحث کے ذیل میں بیان کی جانے والی تمام تفسیریں اس میں جمع ہوگئی ہیں۔ اور یہ ان سب کی جامع ہے۔

اپنے اختلافات میں خداوند پیغمبرؐ کی طرف رجوع کرو:

(۹) نویں آیت میں ''حاکمیت'' کو ''قضاوت'' کے معنی میں لایا گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے: جس چیز میں تم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے (وما اختلفتم فیه من شیء فحکمه الی الله)

ہاں وہی تو ہے جو تمہارے اختلافات کا فیصلہ کرسکتا ہے، کیونکہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ اور باخبر ہے نیز وہ ان پر ولایت یعنی ملکیت

وحاکمیت بھی رکھتا ہے۔

پھر اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے فرماتا ہے: وہی خدا میرا پروردگار ہے (یہی وجہ ہے کہ) میں اسی پر بھروسہ کیے رہتا ہوں۔ اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ (ذٰلکم اللہ ربی علیہ توکلت والیہ انیب)۔

اس آیت کی تفسیر میں بہت سے اقوال ہیں۔ بعض مفسرین اسے لوگوں کے ذاتی اختلافات اور رنجشوں سے متعلق قرار دیتے ہیں کہ جن کا فیصلہ انہیں پیغمبر اکرمؐ سے کرانا چاہیے تھا۔ بعض اس کو آیاتِ قرآن کی تفسیر وتاویل میں اختلاف سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض اہل تفسیر اسے ان علوم میں اختلاف نظر شمار کرتے ہیں..... جو معارفِ دینی اور فرائض وذمہ داریوں سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے روح اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی شناخت کے مسائل ہیں [1]

لیکن آیت کے کسی ایک مطلب تک محدود ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے اور جیسا کہ بہت سے محققین نے کہا ہے یہ آیت ہر قسم کے حکم وفیصلے کو شامل ہے، خواہ وہ احکام ومعارف دین ہوں، خواہ لوگوں کے تنازعات یا آیات متشابہ اور دیگر مسائل ہوں۔

یہ ان آیات میں سے ہے جو اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ تمام مسائل کا حل قرآن وسنت میں موجود ہے لہٰذا از خود قانون سازی کرنے اور قیاس دوڑانے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اگر قرآن وسنت میں تمامی احکام موجود نہ ہوتے تو اختلافات کے بارے میں ان کی طرف رجوع کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ (غور کریں)

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ فخر رازی اور دیگر مفسرین نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس آیت کو فقہی مسائل میں قیاس کے باطل ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔ [2]

کیونکہ یہ آیت کہہ رہی ہے کہ تمام اختلافات کا فیصلہ خدائے تعالیٰ سے حاصل کرنا چاہیے (نیز پیغمبر اکرمؐ بھی فیصلہ دے سکتے ہیں کہ وہ لوگوں میں خدا کے نمائندہ ہیں) پس اگر کتاب وسنت میں احکام وعقائد اور شریعت سے متعلقہ اُمور کا حل پہلے سے نہ کر دیا، ہوتا تو اختلافات میں خداوند جہاں کی طرف رجوع کرنے کے کوئی معنیٰ نہیں تھے۔

(۱۰) دسویں آیت میں ایک کلی نتیجہ کے طور پر پیغمبر اکرمؐ کی زبانی فرمارہا ہے: کیا میں سوائے خدا کے کسی کو اپنا منصف بناؤں حالانکہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے یہ آسمانی کتاب نازل کی ہے جس میں ہر چیز کا ذکر ہے۔ (افغیر اللہ ابتغی حکماً وھو الذی انزل الیکم الکتٰب مفصلاً)۔

بنابریں ''حکم'' و ''قاضی'' صرف خدا کی ذات مقدس ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تمام چیزوں سے آگاہ وباخبر ہے اور یہ قرآن اس

---

[1] روح المعانی جلد ۲۵ صفحہ ۱۵ پر یہ تینوں تفسیریں دیگر مفسرین سے نقل کی گئی ہیں۔

[2] تفسیر فخری رازی جلد ۲۷ صفحہ ۱۴۹۔

کے علم وآ گاہی پر بہترین دلیل ہے [1]

اس بارے میں ''حکمیت'' کس چیز میں مطلوب ہے؟ قرائن بتاتے ہیں کہ یہاں خداوندِ عالم سے پیغمبر اکرم کی حقانیت کے متعلق حکم وفیصلہ مراد ہے۔

اس آیت کی جوشانِ نزول نقل ہوئی ہے وہ بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے، جیسا کہ راوی کہتے ہیں:

مشرکین قریش نے نبی اکرمؐ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہمارے اور اپنے درمیان علماء یہود یا مسیحی پادریوں میں سے کسی کو حکم ومنصف ٹھہرائیں تا کہ وہ آسمانی کتابوں کی رُو سے ہمیں آپ کے مقام اور حیثیت سے آگاہ کریں [2]

اس سے یہ آیت نازل ہوئی کہ جس میں انہیں جواب دیا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ بھی کوئی حکم ومنصف وجود رکھتا ہے؟

علاوہ ازیں اس آیت کا آخری جزء بھی اس مفہوم کا شاہد ہے کہ جہاں فرماتا ہے: جن لوگوں کو ہم نے (اس سے پہلے) آسمانی کتابیں دیں وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن حق کے ساتھ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے (والذین اٰتینھم الکتب یعلمون انه منزل من ربك بالحق)۔

بہرحال اس آیت کا مفہوم بڑی وسعت رکھتا ہے اور یہ بلا استثناء تمام امور میں حکمیت کو خدا کے لیے مخصوص قرار دیتی ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آیت کا مورد نزول اس کے مفہوم کو محدود نہیں کر

مذکورہ بالا دس آیات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ عالم ہستی وعالمِ شرع میں حاکمیت اور نفوذ حکم وفرمان خدائے تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے نیز حاکمیت بہ معنی قانون سازی، قضاوت اور حکومتِ اجرائی (نفاذ قانون) کا سرچشمہ خداوندِ عالم ہی ہے اگر کوئی شخص ان امور میں سے کسی امر یا اس کے ایک جز کا ذمہ دار بنے تو اس کے لیے خدا کا اذن وحکم ضروری ہے۔

البتہ ان دس آیات میں مختلف تعبیرات آئی ہیں۔ بعض میں حاکمیت کے تمام شعبوں کا ذکر ہے اور بعض میں صرف قانون سازی کی طرف اشارہ ہے لیکن مجموعی طور پر ان آیات میں ''توحید حاکمیت'' اپنے تمام پہلوؤں سمیت پوری طرح واضح اور عیاں ہے۔

---

[1] ''حکم'' بروزن ''عمل'' ہے مجمع البیان وتبیاں کے مطابق حکم وہ ہے، جس کا فیصلہ ہمیشہ حق ہو، جبکہ حاکم کا فیصلہ ناحق ہوسکتا ہے، لیکن اس مفہوم کے لیے کوئی واضح دلیل نہیں ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ لفظ ''حکم'' صفت مشبہ ہے اور دوام واستمرار رکھتا ہے۔ یہ لفظ اس پر بولا جائے گا جو ہمیشہ صحیح فیصلہ دے، لیکن جنگ صفین میں حکمین کے تقرر کا واقعہ اس کی نفی کرتا ہے۔ لیکن جب ''حکم'' یا حاکم'' کے الفاظ خدائے تعالیٰ کیلئے استعمال ہوں تو اس سے مراد ایسا فیصلہ ہوگا۔ جس میں ظلم وخطا کا شائبہ نہیں مگر یہ مطلب لُغت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

[2] تفسیر رُوح المعانی جلد ۸ صفحہ ۷۔

توضیحات

(۱) خدائی حاکمّیت عقل کی روشنی میں:

اس بات میں شک نہیں کہ ہر خداشناس شخص جس نے توحید خالق کو مانا ہوا ہے۔ وہ جہانِ ہستی میں اس کے فرمان کو بھی جاری وساری سمجھتا ہوگا۔ جب عالمِ ہستی پر اس کی حاکمیت تسلیم کی جا چکی تو پھر اس کی ولایت وحکومتِ تشریعی میں کوئی شبہ نہیں رہے گا۔ کیونکہ جب اس جہان کا خالق ومالک اور مدیر ومدبر وہ ہے تو بجز اس کے کوئی دوسرا یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ نظامِ تکوین وآفرینش سے ہم آہنگ قانون سازی کر سکے۔

اس طرح جب وہ خالق ومالک اور مدیر ومدبر ہے تو ضروری ہے کہ وہی بندوں پر قانونی حکومت اور ان کے اخلافات کا فیصلہ کرنے کی ذمہ داری کسی کے سپرد کر دئے۔ اس کے علاوہ ہر صورت میں خدا کی مالکیت وتدبیر کے دائرۂ عمل میں بے جا مداخلت تصور کی جائے گی۔

ایک اور لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک صحیح قانون وہی ہے جو انسان کے جسم وجان سے ہم آہنگ ہو۔ اس کی مادی ومعنوی ضرورتیں پوری کرے۔ کم یا زیادہ مدت میں اس کا کوئی برا اثر ظاہر نہ ہو اور معاشرے پر اس کے اجراء کے لیے ایک قوت موجود ہو، نیز لوگوں میں اسے قبول کرنے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہو۔

دوسرے لفظوں میں ایک اصلی قانون ساز وہ ہے جو ایک طرف کامل انسان شناس ہو اور دوسری طرف اس عام ہستی کی صحیح شناخت بھی رکھتا ہو تا کہ وہ انسانوں کے ظاہر وباطن پر نظر رکھتے ہوئے قانون سازی کرے مزید یہ کہ وضع قوانین میں اپنا کوئی فائدہ بھی اس کے پیشِ نظر نہ ہو۔

ہم انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں یہ جو بڑی خرابیاں دیکھتے ہیں تو اس کی وجوہات کچھ یوں ہیں۔

(۱) ایک ایسا شخص جو انسان کے جسم وجان کی باریکیوں کو جانتا ہو اور اس دُنیا میں کارفرما طبعی قوانین سے بھی آگاہ ہو وہ انسانی معاشرے میں نہیں مل سکتا۔ کیونکہ ابھی تو دانش وردوں کی طرف سے انسان موجود ناشناختہ.....جیسی کتابیں لکھی جارہی ہیں، جہاں خود اپنے بارے میں انسان کی معلومات اتنی کم اور اتنی کمزور ہوں وہاں اس وسیع کائنات سے متعلق اس کے علم وآگاہی کا کیا حال ہوگا؟

(۲) انسان ایک ایسا موجود ہے جو بہت سی حاجتیں رکھتا ہے لہٰذا کسی معاشرے میں جو بھی گروہ قانون سازی کرتا ہے وہ اپنے گروہ اور اپنی پارٹی کے مفاد کو مدنظر رکھتا ہے۔

(۳) ان باتوں کو چھوڑتے ہوئے بھی ایک اہم چیز باقی رہ جاتی ہے کہ کوئی انسان غلطی اور غلط فہمی سے مبرا نہیں ہے، اسی وجہ سے انسانوں کے وضع کیے ہوئے قوانین ہمیشہ تغیر وتبدل کی کیفیت سے دوچار رہتے ہیں وقت گزرنے کے ساتھ ان کی خامیاں اور نقائص سامنے آتے ہیں پھر ان میں ایک طرف سے اصلاح کرتے ہیں تو دوسری طرف سے ایک اور نقص سر نکالنے لگتا ہے اس لیے انسانوں کی بنائی ہوئی مجالس قانون ساز بطور آزمائش گاہ کے وجود میں آئی ہیں کہ ہمیشہ سے قوانین کی آزمائش کر رہی ہیں اور آزمائش کا یہ سلسلہ کہیں جا کر نہیں تھمتا۔

بنابریں خدائے تعالیٰ کی مالکیت وحاکمیت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی اصولاً انسان کو پیدا کرنے والا کہ جو اس کے جسم وجان کی تمام حاجتوں سے آگاہ، ہر چیز اور ہر شخص سے بے نیاز اور ہر طرح کی غلطی وغلط فہمی سے منزہ و پاک ہے، اس کے سوا کوئی اور شخص قانون سازی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

لہٰذا ہمارا وظیفہ وذمہ داری صرف یہ ہے قوانین الٰہی کے کلی اصولوں کو اپنے عہد کے تقاضوں سے مربوط کریں اور ان کی روشنی میں قابل عمل جزئی احکام مرتب کر کے خدا کی زمین پر خدا کے قانون کا نفاذ ممکن بنائیں۔

(۲) حکومت ایک امانتِ خداوندی ہے:

مذکورۂ بالا آیات سے بخوبی یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حکومت ایک امانتِ خداوندی ہے، اس لیے حکمرانوں اور عہدیداروں کو خدا کے نمایندوں کی حیثیت سے کام کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر حالت میں حکومت کے اصلی مالک (خدا) کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کا لحاظ رکھیں اور ان کے تحت اپنے فرائض ادا کریں۔

حضرت داؤدؑ جو تاریخ انسانی میں مذکور بڑی بڑی حکومتوں میں سے ایک حکومت کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ ان سے خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے داؤدؑ! ہم نے تمہیں زمین پر اپنا خلیفہ (اور نمایندہ) قرار دیا ہے، لوگوں میں حق کے ساتھ حکم وفیصلہ کرو، اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہیں خدا کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ (یداوداانا جعلنك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق و لاتتبع الهوٰى فيضلك عن سبيل الله۔ (ص ۲۶)۔

یہ تعبیر بھی حکومت کے امانت خداوندی ہونے کا پتہ دیتی ہے۔ نیز ایک مکمل شرعی والٰہی حکومت کے نقوش کو بڑی عمدگی کے ساتھ واضح وعیاں کرتی ہے۔

(۳)۔ حکومت کی تشکیل صرف خدا کی طرف سے ہے:

اسلام اور نظریہ توحید کی رو سے حکومت طرف بالا سے تشکیل پاتی ہے نہ جانب پست سے..... یعنی حکومت خدا کی طرف سے ہے نہ لوگوں کی طرف سے..... تاہم عوامی تائید بھی خدا کی طرف سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی اس امانت الٰہی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کی وضاحت یوں ہوسکتی ہے کہ نظریہ توحید اور نظریہ شرک میں جو فرق پائے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ ایک توحید پرست انسان حکومت کو اس کی تمام شاخوں (قانون، اجرائی، قضائی) سمیت خدا کی طرف سے تصور کرتا ہے جو انبیاء ان کے اوصیاء اور پھر علماء وصلحاء اُمت کو ملتی ہے۔

ان احکام کے لیے لازم ہے کہ وہ خود خدا کے سامنے جواب دہ سمجھیں اور ہر بات سے پہلے اس کی رضاء پر نظر رکھیں اور اس کے بندوں کے ہمدرد اور خدمت گذار بن کر رہیں۔ ایسی حکومت خالقِ اکبر کے پیغام سے الہام پا کر لوگوں کی راہنمائی کرسکتی ہے نہ یہ کہ بے راہ خواہشوں اور گناہ آلود کاموں کے پیچھے چل پڑے۔

اس صورت میں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حکومت اسلامی میں عوامی رائے کا کوئی دخل نہیں اور یہ دراصل صالحین کی آمریت ہے۔

لیکن یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے، کیونکہ اس شوریٰ کہ جوتوحیدی آئین میں حکومت کی ایک بنیاد کے طور پر ذکر ہوئی، قرآن نے اس کی تاکید فرمائی اور پیغمبرؐ اکرم کا عمل اس پر گواہ ہے کہ جوعقلِ کل کے مقام پر فائز تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند تعالیٰ جو''مالک الملک'' اور احکم الحاکمین'' ہے.....اس نے یہ حکم دیا کہ امور حکومت میں لوگوں سے مشورہ لیا جائے تا کہ وہ ان مین شریک وحصہ دار ہوں۔

اس نظر سے حکومت توحیدی واسلامی، عوامی مذہبی حکومت قرار پائے گی، یعنی اس میں لوگوں کی آراء اور خدا کے حکم کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن یہ عوامی رائے اصول دین اور احکام الٰہی کے حدود اربعہ میں رہنی چاہیے.....اس قول کی شرح انشاء اللہ حکومت در اسلام'' کے مباحث میں آئے گی۔

نتیجہ کلام یہ ہے کہ مثلاً عام لوگ جب صدر جمہوریہ یا ارکان شوریٰ کے انتخاب میں ووٹ ڈالنے جائیں تو اس نکتے کی طرف متوجہ رہیں کہ خدا نے ان کو حق رائے دہی عطا فرمایا ہے۔یعنی وہ امانت دار الٰہی ہیں اور یہ ووٹ جو حکم وفیصلہ (حکومت) کی ایک قسم ہے اسے کسی ایسے شخص کے حق میں استعمال کریں، جس میں خدا کے پسندیدہ عادات وخصائل موجود ہوں ورنہ وہ امانت میں خیانت کے مرتکب قرار پائیں گے۔

سورۂ نساء کی آیت ۵۸ میں آیا ہے: خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل لوگوں کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم وفیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے کام لو(ان اللہ یامرکم ان تودوا الامٰنٰت الی اھلھا واذا حکمتم بین النّاس ان تحکموا بالعدل)۔

روایات اسلامی میں آیا ہے کہ امانت کے اطلاقات میں سب سے اہم''حکومت'' ہے تفسیر درمنثور میں بھی اس کی تاکید ہوئی ہے: لوگوں کے امام وحاکم پر لازم ہے کہ وہ خدا کے فرمان کے مطابق حکومت ان یودی الامانۃ)[1]

بنابریں ووٹ دینے والے لوگوں کو یہ کبھی نہ سوچنا چاہیے کہ کون سا صدر جمہوریہ اور کونسا رُکن شوریٰ ان کے ذاتی یا گروہی مفادات کی حفاظت کرے گا یا ان میں سے کون ان کے ساتھ دوستی یا رشتہ داری کا تعلق رکھتا ہے اور کون انہیں پسند یا ناپسند ہے۔ بلکہ وہ ہر موقع پر خدا و رضائے خدا اور انسانی ودینی اوصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا ووٹ استعمال کریں تا کہ حق امانت ادا ہو سکے۔

لیکن مادیت پرست جمہوری وعوامی حکومتوں میں ممکن ہے کہ ووٹ دینے والے لوگ ذاتی پسند وناپسند، گروہی تعصب، سیاسی وابستگی، ناجائز مالی فوائد اور خصوصی رابطے کو پیش نظر رکھ کر اپنا ووٹ استعمال کریں اور اس امانتِ الٰہی میں خیانت کے مرتکب ہوں، جب کہ اسلامی حکومت میں صرف رضائے الٰہی اور فلاحِ انسانی کے لیے ووٹ دیا جاتا ہے۔ع

بہ بین تفاوت راہ از کجاست تا بہ کجا

---

[1] تفسیر ورالمنثور جلد ۲ صفحہ ۱۷۵۔

(۴) توحیدحاکمیت پرایمان رکھنے کے اخلاقی اثرات:

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ توحید حاکمیت پر ایمان یعنی زندگی کے ہر گوشے پر خدا کی حکومت کا اعتقاد اور یہ نظریہ کہ حکومت انسانوں کے ہاتھ میں خدا کی امانت ہے، اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ لوگ حکومت کے اعلیٰ ودانیٰ عہدوں کیلئے انتخاب کرنے وقت اس بات کو مدِنظر رکھتے ہیں کہ حکومت خدا کی عطاء اور اس کی امانت ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ الٰہی ضابطے کے مقابلے میں کسی شخص سے اپنے ذاتی رابطے کا لحاظ کریں اور ایسا کوئی امکان نہیں کہ وہ معاشرے کے مفاد کو اپنے شخصی مفاد پر قربان کریں۔

جہاں تک حکمرانوں اور فرماں رواؤں کا تعلق ہے ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑی مصیبت یہی خودغرض صاحبان حکومت ہیں جو طول تاریخ میں ہزاروں مرتبہ دنیا کے بڑے بڑے خطوں کو اور بعض اوقات پوری دنیا کو آتش جنگ وجدل کی طرف کھینچ لائے، اس طرح انہوں نے نوع انسان کے ایک بڑے حصے کو تنگی وسختی اور رنج والم کے اندھے کنوؤں میں دھکیل دیا۔

ہمارے ماضی قریب میں ہٹلر نے لاکھوں انسانوں کو موت کے منہ میں ڈال دیا، اسٹالن کے ہموطنوں نے اس کے بارے میں وحشت ناک اعداد وشمار شائع کیے ہیں، ان کے مطابق وہ تین کروڑ انسانوں کا قاتل پایا گیا اور اب بھی دنیا کے حالات ایسے ہی ہیں اگرچہ ان کی شکل کچھ بدلی ہوئی ہے۔ آج بھی اگر کوئی حکمران توحیدی نظریہ رکھتا ہو اور حکومت مطلقہ کو خدا کیلئے مخصوص سمجھے کہ جو اسے لوگوں کی آراء اور ان کی تائید سے خدا نے عطا کی ہے تو وہ کبھی مغرور، ظالم اور خودغرض نہیں بنے گا..... وہ حکومت پر فائز ہوتے ہوئے بھی امیر المومنین امام علی بن ابی طالبؑ کی طرح کہہ اُٹھے گا: اگر خدا نے علماء حق سے یہ عہد نہ لیا ہوتا کہ وہ ظالموں کی سیری اور مظلوموں کی گرسنگی پر خاموش نہ رہیں گے تو میں ناقہ خلافت کی مہار اس کے کندے پر ڈال دیتا (اور یہ حکومت کہ جس کیلئے دنیا پرستوں کے سینے چاک ہوئے جاتے ہیں میں اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا) [1]

ہاں! ایسا حاکم ہر حال میں حکومت کو امانت الٰہی اور خود کو اس کا امانت دار اور اس مالک اصل کے سامنے جوابدہ سمجھتا ہے۔

یہ نقطہ نظر اس دنیا میں حکومت کے طور طریقوں کو یکسر تبدیل کر سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ انسان اس نظریئے کو اپنے دل کی گہرائیوں میں بسالے اور یہ روح انسان پر اپنا رنگ چڑھادے۔ یہ بات صرف سربراہان حکومت کیلئے نہیں بلکہ حکومت کے تمام کارگزاروں..... گورنروں، جنرلوں، افسروں مجسٹریٹوں، ججوں اور ماتحت ملازمین۔ پر بھی صادق آتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اختیارات کو امانت الٰہی تصور کرتے ہوئے اس کی رضا وفرمان کے مطابق استعمال کرے۔ گزشتہ مباحث میں جو کچھ کہا گیا ہے مجموعی طور پر اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں حکومت کی شکل نہ آمرانہ ہے۔ اور نہ مغربی جمہوریت سے مشابہ ہے بلکہ ایک عوامی حکومت ہے جو اصولِ دین کی حدود میں رہ کر کام کرتی ہے۔ وہ دراصل حکومت الٰہیہ کا رنگ رکھتی ہے اور اس کے بتائے ہوئے طریقے سے عوامی تائید حاصل کرتی ہے یہی اس کا وہ امتیازی پہلو ہے جو اسے دنیا کے دیگر طریق ہائے حکومت سے الگ قرار دیتا ہے۔ حکومتِ از نظر قرآن'' کے بارے میں بحث کے کئی گوشے ہیں، یہاں فقط ''اور'' سرچشمہ حکومت خدا ہے۔ کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے کے باقی مباحث انشاءاللہ کلی حکومت'' کے زیرعنوان پیش کیے جائیں گے۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ۔ ۳

(۵) توحید اطاعت

اشارہ:

اقسام توحید کے ضمن میں آخری بات یہ ہے کہ ایک موحد انسان صرف خدا کو واجب الاطاعت جانتا ہے اور اسی کی بندگی کا طوق اپنی گردن میں ڈالتا ہے وہ فخر کرتا ہے کہ میں خدا کا بندہ ہوں کہ آنکھ اور کان اس کے حکم کی طرف اور اپنی جان ہتھیلی پر رکھتا ہوں۔

البتہ اس کے بھیجے ہوئے پیغمبروں۔ان کے معصوم جانشینوں اور پھر ان کی طرف سے مقرر کیے گئے نائبوں اور عاملوں کی اطاعت بھی خدا ہی کی فرمانبرداری شمار ہوتی ہے۔لہٰذا وہ موحد انسان ان کے حکم کو بھی بسروچشم مانتا ہے۔وہ صرف ایک ہی چیز کے خیال میں رہتا ہے۔اور وہ محبوب حقیقی (خدائے واحد) کی رضا اور اس مالک اصلی کے احکام پر عمل بجالانا ہے۔

ایک مرد موحد کسی صورت میں بھی ''ناراضی خدا'' کے بدلے میں ''خوشنودی افراد'' اور ''معصیت خداوندی کے بدلے میں'' ''پیروی انسان'' کی طرف متوجہ نہیں ہوتا کیونکہ وہاں سے شرک کی ایک قسم سمجھتا ہے۔

توحید کی یہ قسم کہ جو ''توحید اطاعت'' کہلاتی ہے۔اصل میں ''توحید حاکمیت'' سے قوت پاتی ہے۔جس کا ذکر گزشتہ بحث میں کیا گیا ہے۔اس اشارے کے ساتھ ہی ہم قرآن کے حضور پہنچتے اور آیاتِ ذیل کی صدا دل کے کانوں سے سنتے ہیں:۔

(۱) وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ [۵:۹۲] (مائدہ)

(۲) قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ [۳:۳۲] (آل عمران)

(۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾ [۴:۵۹] (نساء)

(۴) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا [۶۴:۱۶] (تغابن)

(۵) فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (آل عمران ۵۰، شعرا ۱۷۹، ۱۶۳، ۱۲۶، ۱۰۸، زخرف ۶۳)

(۶) اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ [۷:۳]

(اعراف)

(۷) وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝۳۶ [۳۳:۳۶] (احزاب)

(۸) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱ [۴۹:۱] (حجرات)

(۹) اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳۱ [۹:۳۱] (توبہ)

(۱۰) اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْۤ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۶۰ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝۶۱ [۳۶:۶۱] (یٰس) [ا]

ترجمہ:

(۱) خدا اور پیغمبر کی اطاعت کرو اور (نافرمانی سے) بچتے رہو پس اگر تم روگردانی کرو گے۔ (سزا کے مستحق ہو گے) تو جان لو کہ ہمارے پیغمبر کا فریضہ بس صاف صاف بتا دینا ہے۔

(۲) (اے حبیب) کہو کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو پس اگر وہ سرپیچی کریں تو (جان رکھیں) خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۳) اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو اللہ کے رسول اور صاحبانِ امر کی اور جب کسی چیز میں نزاع ہو تو اسے خدا د رسولؐ کی طرف پلٹا دو اگر تم خدا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو۔

(۴) جہاں تک ہو سکے تقوائے الٰہی اختیار کرو۔ اس کا حکم دھیان سے سنو اور اطاعت کرو۔

[ا] قرآن میں اس مضمون کی اور بھی بہت سی آیات موجود ہیں۔ مثلاً۔ انفال۔ ۲۰۔ ۴۶۔ نور۔ ۵۴، محمد۔ ۳۳۔ مجادلہ۔ ۱۳۔ نساء۔ ۱۶۔ انعام۔ ۱۵ یونس۔ ۱۵۔ زمر۔ ۱۳

(۵) تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

(۶) خدا کی طرف سے نازل کیے گئے احکام کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے معبودوں کی پیروی نہ کرو۔

(۷) جو کوئی خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں گرفتار ہے۔

(۸) اے ایمان لانے والو! کسی امر میں خدا اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھا کرو، تقوائے الٰہی اختیار کرو، یقیناً وہ سنتا جانتا ہے۔

(۹) ان لوگوں نے اپنے علماء صلحاء کو خدا کے مقابل معبود بنا رکھا ہے اور (اسی طرح) عیسیٰ بن مریمؑ کو بھی، حالانکہ انہیں حکم نہیں دیا گیا، مگر یہ کہ خدائے واحد کی عبادت کریں۔ جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پاک و منزہ ہے وہ اس بات سے کہ یہ لوگ اس کے شریک ٹھہراتے ہیں۔

(۱۰) اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ اور یہ بھی کہ تم میری ہی عبادت کرتے رہنا کہ یہی سیدھا راستہ ہے۔

مفردات کی تشریح:

''اطاعت'' اس کے معنی تابع ہونا اور حکم ماننا ہیں، یہ وہ معنی ہیں کہ بہت سے ماہرین لغت نے ان کی تصریح کی ہے، پھر اسے حکم و فرمان کی پیروی کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا۔

بعض اہل لغت نے ''اطاعت'' اور ''مطاوعت'' میں فرق کیا ہے، یعنی اطاعت کے معنی تابع ہونا اور حکم کی پیروی کرنا بتائے ہیں جب کہ مطاوعت کے معنی موافقت و ہم آہنگی قرار دیئے ہیں، اسی لیے کتاب ''العین'' کے مولف خلیل بن احمد نے لکھا ہے کہ حاکم کی نسبت سے رعایا کے لیے لفظ ''اطاعت'' بولا جاتا ہے۔ اور شوہر کی نسبت سے زوجہ کے لیے ''طواعیت'' یا مطاوعت'' کا استعمال کیا جاتا ہے۔

آیات کی جمع آوری وتفسیر

خداوند! ہم صرف تیرے فرمان کے مطیع ہیں:

(۱) پہلی آیت میں اگرچہ شراب، جوا، انصاب (بتوں کی ایک قسم) اور ازلام (قسمت آزمائی کے ایک کھیل) کو حرام قرار دینے کے بعد خدا اور رسُول کی اطاعت کا حکم آیا ہے۔ لیکن بن کہے ظاہر ہے کہ یہ ایک عمومی فرمان ہے جیسا کہ فرماتا ہے۔ خدا اور پیغمبرؐ کی اطاعت کرو اور (نافرمانی سے) بچتے رہو۔ (واطیعو الله واطیعو الرسول واحذروا)۔

پھر اس بات کی تاکید کے طور پر فرمایا: پس اگر تم روگردانی کرو گے (سزا کے مستحق ہو گے) تو جان لو کہ ہمارے پیغمبرؐ کا فریضہ بس صاف صاف بتا دینا ہے۔ (فان تولیتم فاعلموا انما علی رسولنا البلاغ المبین[1])

یہ سامنے کی بات ہے کہ اطاعت رسول خدا کی اطاعت کا ایک جزاور عکس ہے اور ایک طرح سے وہ بھی بعینہٖ اطاعتِ خدا ہی ہے، کیونکہ حضور اکرمؐ خدا کے قول وحکم کے علاوہ کچھ اور بیان نہیں فرماتے، یہ جو ''اطیعوا'' کا لفظ دوبارہ آیا ہے تو اس سے یہی مراد ہے کہ خدا کی اطاعت ذاتی واصلی ہے اور دوسری اطاعت فرعی وظاہری ہے۔

(۲) دوسری آیت میں یہ مضمون پیغمبر اکرمؐ سے خطاب کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے (اے حبیب) کہو کہ خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، پس اگر وہ سرپیچی کریں تو (جان رکھیں) خدا کافروں کو دوست نہیں رکھتا (قل اطیعو الله والرسول فان تولو فان الله لایحب الکافرین)۔

ذیل آیت سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کے حکم سے سرتابی کفر ہے۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جب خدا اور رسولؐ کے فرمان کی نسبت عناد ودشمنی رکھنے کے باعث ان کے حکم سے سرتابی کی جارہی ہو۔ یا یہ کہ ہم کفر کو وسیع معنی میں لیں اور ہر قسم کی نافرمانی اور گناہ اس میں شامل سمجھا جائے بہرحال یہ آیت خدا ورسولؐ کی اطاعت کے وجوب پر ایک تاکید ہے یعنی یہ کتاب وسنت کی پیروی کو لازم قرار دیتی ہے۔

اگرچہ اس آیت میں پیغمبر اکرم کا بلاواسطہ اللہ سے عطف ہوا ہے۔ لیکن اس سے پہلی آیت میں جو کہا گیا (اے نبی) کہو کہ اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو (قل ان کنتم تحبون الله فاتبعونی) اس سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اطاعت رسولؐ

---

[1] اس آیت میں جزائے شرط محذوف ہے اور ترتیب کے لحاظ سے صورت یہ ہے ''قامت الحجة علیکم یا استحققتم العاب، یا ''لم تضروا بتولیکم الرسول، (تفسیر مجمع البیان تفسیر فخر رازی تفسیر روح المعانی۔ تفسیر مراغی میں آیت زیر بحث کے ذیل میں دیکھیں۔

خدا کی اطاعت ہی کی ایک شاخ ہے۔

یہ آیت بخوبی واضح کرتی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے ساتھ سچی اور کھری محبت کی علامت یہ ہے کہ دل وجان سے ان کی اطاعت اور پیروی کی جائے ورنہ ان سے محبت کا دعویٰ ایک جھوٹ ہے یا محبت ہے تو سہی مگر بڑی کمزور ہے۔

(۳) تیسری آیت اطاعت خدا اور رسولؐ کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کو ضروری قرار دیتی اور یہ فرمان سناتی ہے: اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو خدا کی اطاعت کرو رُسولؐ اور صاحبانِ امر کی اور جب کسی چیز میں نزاع ہو تو اسے خدا اور رسولؐ کی طرف پلٹا دو، اگر تم خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو(یایھا الذین اٰمنوا اطیعوا الله واطیعو الرسول واُولِي الامر منكم فان تنازعتم فی شیء فردوه الیٰ الله وارسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاٰخرِ)۔

یہ الفاظ وعبارت بھی بڑی وضاحت سے بتا رہے ہیں کہ اطاعت خدا کے مخصوص ہے، پھر پیغمبرؐ اور اولی الامر کی اطاعت کا حکم کہ ہر نزع واختلاف کے حل کی خاطر ان کی طرف ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اگر انسان کا طرزِ عمل اس کے مطابق نہیں تو پھر خدا وقیامت پر اس کے ایمان میں تزلزل اور ڈگمگاہٹ در آتی ہے۔

(۴) چوتھی آیت میں صرف اطاعت خدا کا ذکر ہے جیسا کہ فرماتا ہے: جہاں تک ہو سکے تقوائے الٰہی اختیار کرو، اس کا حکم دھیان سے سنو اور اطاعت کرو(فاتقوا الله ما استطعتم و اسمعوا و اطیعوا)۔

سب سے پہلے تقویٰ اور گناہ سے پرہیز کا حکم دیتا ہے کیونکہ کسی چیز کو پاک وصاف کرنا اسے سجانے بنانے سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اس لیے تقویٰ کے فرمان کے بعد حکم خدا کو سننے کو ہدایت کی ہے کہ سننا اطاعت کرنے پر مقدم ہے اور پھر شرط اطاعت وپیروی کرنے کا امر وحکم دیا ہے......یہی وہ اطاعت ہے جو خدا کے لیے مخصوص ہے۔

یہ جو بعض نے گمان کیا ہے۔ فاتقو الله ما استطعتم جہاں تک ہو سکے تقوائے الٰہی اختیار کرو کہ جو تقویٰ کا حق ہے۔ لیکن یہ ایک غلط فہمی ہے کیونکہ یہ دونوں جملے ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں وہ اس طرح کے حق تقویٰ اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ انسان سے جہاں تک ہو سکے پرہیز گاری اختیار کیے رہے۔

(۵) پانچویں آیت جو قرآن میں بہت سے پیغمبروں کی زبان سے آئی ہے۔ یہ پہلے تقویٰ کا حکم دیتی اور پھر پیغمبروں کی اطاعت کرنے کی تاکید کرتے ہوئے کہتی ہے: تقوائے الٰہی اختیار کرو اور میری (پیغمبر کی) اطاعت کرو(فاتقو الله و اطعیونِ
(

یہ جملہ جیسا کہ ہے.....حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیبؑ اور حضرت مسیحؑ کی زبانی قرآن میں نقل ہوا ہے (ایک بار بہ زبانِ نوحؑ: سورہ شعراء ۱۰۸ دوبار بزبانِ ہودؑ شعراء ۱۲۶، ۱۳۱، دوبار بزبان صالحؑ: شعراء ۱۴۴، ۱۵۰ ایک بار بزبان لوط: شعراء ۱۶۳، ایک بار بہ زبان شعیبؑ: شعراء ۱۷۹ اور دوبار بہ زبان مسیحؑ: آل عمران۔ ۵۰، زخرف۔ ۶۳)۔

یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ درجہ اوّل میں یہ اطاعت ایمان بالتوحید اور ترک بت پرستی سے متعلق ہے اور دوسرے مرحلے میں تمام دینی احکام کی اطاعت ہے جو انبیاء سے ملتے ہیں۔ یہ اصل میں فرمانِ خدا کی اطاعت ہے کیونکہ وہ اس کے قول وحکم کے بغیر کچھ نہ کہتے تھے۔

(۶) چھٹی آیت میں احکام الٰہی کی پیروی کا ذکر ہوا ہے جو اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے، اس میں اس بات کا اضافہ ہے کہ یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ خدا کے سوا کسی کی اطاعت و پیروی نہ کرو۔ یہ نفی واثبات ''توحیدِ اطاعت'' کا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: خدا کی طرف سے نازل کیے گئے احکام کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے معبودوں کی پیروی نہ کرو (اتبعو ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعو من دونہٖ اولیآءَ)

یہ آیت خدا کے علاوہ لوگوں کے خودساختہ معبودوں کی اطاعت پر خط بطلان کھینچتی ہے، جو کوئی بھی ہے اور جہاں بھی ہے وہ ان کی اطاعت کو چھوڑ کر خدائے واحد کی اطاعت اختیار کرے۔

یہ آیت اور ایسی ہی دیگر آیات کھلی ہوئی گواہی دیتی ہیں کہ انسانوں کے احکام وآراء جیسی کچھ بھی ہوں پیروی کے لائق نہیں ہیں (کیونکہ وہ خطاء وغلطی سے پر ہیں، جب کہ ہم خدا کے علاوہ غیروں کی اطاعت کے لازم ہونے کی کوئی دلیل بھی نہیں پاتے)۔

(۷) ساتویں آیت میں اس امر کی تصریح کرتا ہے کہ کسی باایمان مرد وزن کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے حکم کے سامنے اپنا کچھ بھی اختیار رکھتے ہوں۔ جیسا کہ فرمایا: جو کوئی خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں گرفتار ہے۔ (ومن یعصِ اللہ ورسولہٗ فقد ضل ضللاً مبیناً)۔

آیت کا شروع وآخر ''توحید اطاعت'' کو بیان کرتا ہے، اسے ایمان کی علامت شمار کرتا اور اس کی مخالفت کو ضلال مبین (کھلی گمراہی) کہتا ہے، اس سے بڑی گمراہی اور کیا ہوگی کہ انسان خداوند عالم کو جو رحمان ورحیم ہے چھوڑ دے اور اس کے غیروں کے پیچھے ہوئے؟

(۸) آٹھویں آیت میں مومنین سے خطاب ہے اور اس کے لیے کئی ایک شان ہائے نزول ذکر ہوئی ہیں تاہم وہ سبھی گواہی دیتی ہیں کہ کبھی کبھار بعض مسلمان خدا اور رسولؐ سے سبقت کرتے اور کہتے تھے: اگر فلاں حکم اس طرح نازل ہوتا تو بہتر

تھا......اس پر یہ آیت اُتری اور اس میں ان لوگوں کو خبردار کیا گیا: اے ایمان لانے والو! کسی امر میں خدا اور اس کے رسولؐ سے آگے نہ بڑھا کرو، تقوائے الٰہی اختیار کرو۔ یقینا وہ سنتا جانتا ہے......حتیٰ کہ تمہارے خفیہ باتوں کو سنتا اور تمہارے سینہ میں چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے......(یٰاَیھا الذین اٰمنو لاتقدموبین یدیِ اله ورسولهٖ واتقوا الله اِن الله سمیعٌ علیمٌ)

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ خدا امکان نہیں رکھتا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس سے آگے نہ بڑھا کرو دراصل یہ اس سے کنایہ ہے کہ کسی بات اور کسی کام کے بارے میں اس پر سبقت نہ کرو[1]

بہرحال یہ آیت نہ صرف حکمِ الٰہی کی اطاعت کو لازم کرتی ہے۔ بلکہ یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر کام میں ہمیشہ اس کے فرمان کا انتظار کیا کرو، پھر جب حکم دے دیا جائے تو نہ تندی (تیز روی) کرو، اور نہ کندی (سست روی) کرو کیونکہ ان دونوں طرح کے لوگ غلط فہمی میں ہیں۔

تفسیر مراغی میں عربی ادبیات کے بعض ماہرین کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ "لا تقدم بین یدیِ الامام کا مفہوم یہ ہے کہ کاموں کی انجام دہی میں امام سے پہل نہ کرو۔

عالموں اور رہبروں کی پرستش نہ کرو:

(۹) نویں آیت میں یہود و نصاریٰ کی مذمت ہوئی ہے کہ کیوں وہ اپنے علماء وصلحا کو خدا کے مقابل اپنے معبود قرار دیتے ہیں، چنانچہ فرماتا ہے: ان لوگوں نے اپنے علماء وصلحاء کو خدا کے مقابل معبود بنا رکھا ہے۔

(اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دونِ الله)[2]۔

---

[1] یہاں "لاتقدمو" کے بمعنیٰ "لا تقدموا" ہونے میں مفسروں کے درمیان بحث گفتگو ہے (پہلا جملہ باب تفعل سے اور دوسرا باب تفعل سے ہے) لیکن جملہ "بین یدی الله ورسوله" کا مفہوم پہلی صورت میں: خدا اور رسولؐ پر سبقت نہ کرنا ہے۔ دوسری صورت میں اس کا مفہوم: کسی چیز کو خدا اور رسولؐ کے احکام سے مقدم نہ سمجھنا ہے، ان میں معنیٰ اول زیادہ مناسب ہیں۔

[2] "احبار" جمع "حِبر" بروزن "ابر" ہے یا "حَبر" بروزن "فکر" اچھے اثر کے معنیٰ میں ہے۔ بعد میں اسے عالم و دانش مند کے لیے استعمال کیا گیا، جیسے ابن عباس کو "حبر الامۃ" کا لقب دیا گیا ہے "رہبان" جمع ہے "راہب" کی بعض نے کہا ہے کہ یہ واحد وجمع ہر دو کے لیے آتا ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں "خدا ترس شخص" اور یہ عیسائیوں میں ایک گروہ ہے، کاروبار اور ازواج کو ترک کر کے خانقاہوں میں عبادت کیا کرتے ہیں۔ (المفرداتِ راغب وغیرہ)۔

اس طرح انہوں نے حضرت مسیح ابن مریمؑ کو بھی ایک معبود کا درجہ دے رکھا ہے (والمسح ابن مریم)
حالانکہ انہیں حکم نہیں دیا گیا مگر یہ کہ خدائے واحد کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، پاک ومنزہ ہے۔ وہ اس بات سے جو یہ لوگ اس کے شریک ٹھیراتے ہیں۔ (وما امروا الا لیعبدوا الھا واحدا لا الہ الا ھو سبحنہٗ عما یشرکون

یہ مانا کہ یہود ونصاریٰ اپنے علماء وصلحاء کے بارے میں الوہیت کا اعتقاد نہیں رکھتے، وہ ان کی عبادت اس طرح ہرگز نہیں کرتے، جیسے ہم خدا کی عبادت کرتے ہیں، پھر کیوں قرآن نے ان کے متعلق ''رب'' اور ''الٰہ'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں؟

اس کا جواب امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ سے منقول ایک روایت میں آیا ہے کہ فرمایا: اما واللہ ما صاموا (لھم) ولا صلوا ولکنھم احلوا لھم حراماً وحرموا علیھم حلالاً فاتبعوھم وعبدوھم من حیث لا یشعرون۔ [1] قسم بخدا کہ وہ اپنے پیشواؤں کے لیے نہ روزہ رکھتے اور نہ نماز پڑھتے، بلکہ وہ پیشوا ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا دیتے تو وہ اس پر عمل کرتے..... اس طرح وہ انجانے میں ان کی پرستش کرتے تھے۔

یہ حدیث مختلف طرق سے شیعہ وسنی کتب حدیث میں آئی ہے، ہم ان میں سے بعض کتابوں میں اسے یوں پاتے ہیں: عدی بن حاتم (مشہور حاتم طائی کے فرزند) حضرت رسولؐ کی خدمت میں آئے، جبکہ ان کی گردن میں سنہری صلیب لٹک رہی تھی، حضورؐ نے فرمایا، اس بت کو اپنے گلے سے اُتار پھینکو! عدی کہتے ہیں..... میں نے سنا کہ نبی اکرمؐ آیت: اتخذوا احبارھم ..... کی تلاوت کر رہے تھے میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ لوگ ہرگز اپنے علماء پرستش نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا: آیا ایسا نہیں کہ ان کے علماء حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتے ہیں۔ اور وہ لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں؟ میں نے عرض کیا: ہاں ایسا ہی ہے! آپ نے فرمایا: یہی پرستش ہے جو وہ لوگ کر رہے ہیں [2]

اس طرح واضح ہو رہا ہے کہ جو لوگ حکمِ خدا کے خلاف فرمان دیتے ہیں ان کی اطاعت وپیروی بھی شرک کی ایک قسم ہے۔

(۱۰) دسویں اور آخری آیت میں تمام انسانوں (بنی آدم) کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے: اے اولادِ آدم! کیا میں نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا کہ شیطان کی پرستش نہ کرنا کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

(الم اعھد الیکم یٰبنی ادم ان لا تعبدو الشیطٰن انہ لکم عدو مبینٌ)۔

اور یہ بھی کہ تم میری ہی عبادت کرتے رہنا کہ یہی سیدھا راستہ ہے (وان اعبدونی ھذا صراطٌ مستقیم)۔

مان لیا کہ کوئی شخص (رکوع وسجود اور نماز اور روزہ کی شکل میں) شیطان کی پرستش نہیں کرتا، پھر یہ کونسی عبادت ہے کہ جس سے نہی ہو رہی ہے؟ کیا یہ اطاعت کے علاوہ کوئی چیز ہو سکتی ہے۔

ہاں! وہ لوگ جو شیطان کے مطالبوں کو مان لیتے اور اس کے حکم کو حکم خدا پر مقدم شمار کرتے ہیں، وہ مشرک اور شیطان پرست ہیں یہ

---

[1] تفسیر مجمع البیان جلد ۵ ص ۲۳، تفسیر برہان جلد ۳ ص ۱۲۰

[2] تفسیر رُوح المعانی جلد ۱۰ صفحہ ۷۵، یہی مطلب دیگر تفاسیر میں بھی آیا ہے، اور کچھ تفاوت کے ساتھ تفسیر دار المنثور میں بھی منقول ہے۔

رکوع وسجود میں شرک نہیں، حکم ماننے میں شرک ہے۔

جس عہد و پیمان کا حوالہ دیا جارہا ہے، خدا نے فرزندانِ آدم سے وہ عہد کہاں اور کیسے لیا؟ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عہد ''عالمِ ذر'' میں لیا گیا اور بعض کے نزدیک اس سے مراد وہ وعظ ونصیحت ہے جو پیغمبرانِ الٰہی اپنی اپنی قوموں کو کرتے رہیں۔ لیکن ظاہراً یہ آیت اس عہد کی طرف اشارہ کرتی ہے جو ہبوط آدم کے وقت بنی آدم سے لیا گیا اور وہ سورۂ اعراف۔ آیت ۲۷ میں مذکور ہے۔ فرماتا ہے۔ اے فرزندانِ آدم شیطان تمہیں دھوکہ نہ دے جائے۔ جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ (آدمؑ وحوا) کو جنت سے نکال دیا تھا۔ (یبنی آدم لایفتننکم الشیطن کما اخرج ابویکم من الجنة)۔

اسی طرح سورۂ اعراف ہی کی آیت ۲۲ میں حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے شیطان تم دونوں (میاں بیوی کا) کھلا ہوا دشمن ہے (ان الشیطین لکما عدوٌ مبینٌ)۔

پھر سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۱۷ میں حضرت آدمؑ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے ہم نے کہا اے آدم! یہ شیطان تمہارا اور تمہاری زوجہ کا دشمن ہے۔ (فقلنا یادم ان هذا عدو لك ولزوجك)۔

ظاہر ہے کہ ایسا دشمن آدم وحوا کی اولاد کا بھی دشمن ہوگا، کیونکہ اس کی عداوت صرف آدمؑ سے نہیں، بلکہ وہ ان کے تمام فرزندان اور ان کی پوری نسل سے عدوات رکھتا تھا، لہٰذا اس نے شروع ہی میں قسم کھائی: میں تھوڑے سے مخلص بندوں کے سوا تمام فرزندانِ آدم کو گمراہ کروں گا۔ (اسراء۔ ۶۲، ص۔ ۸۲)۔

توضیحات

(۱) مطاعِ مطلق صرف خدا ہے

مذکورہ بالا آیات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اسلام اور قرآن کی نظر میں ''واجب الاطاعت'' فقط خدا ہے اور جن لوگوں کی اطاعت خدا ہی کی اطاعت ہے وہ بھی اسی میں شامل ہیں لیکن فرمانِ خدا کے مقابلے میں کسی کی اطاعت وپیروی قرآن کی نظر میں ایک قسم کا شرک اور بت پرستی ہے۔

لہٰذا اگر پیغمبر وامام یا ماں باپ کی اطاعت لازم ہے تو اس لیے کہ یہ فرمانِ خدا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، مگر اس لیے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے (وما ارسلنا من رسولٍ الا لیطاع باذن الله (انساء۔ ۶۴)۔

اس مسئلے کو دلیل عقل سے بھی ثابت کیا جاسکتا ہے کیونکہ مطاع مطلق صرف وہی ہے جو ہر چیز سے آگاہ حکیم وخبیر، ہر طرح کی خطاء سے پاک اور رحمن ورحیم ہے، یہ صفات صرف ذات خداوندی میں جمع ہیں۔ اگر حکمرانوں، دوستوں فرزندوں، رشتہ داروں حتیٰ کہ اپنے دل کی چاہت خدا کی رضا کے مطابق نہ ہو تو اس کی پیروی طریق دراہِ شرک ہے۔

ایک توحید پرست انسان کہتا ہے: اگر میں سوئی کے ناکے برابر بھی خدا کی اطاعت سے ہٹوں تو میں مشرک ہوں۔ کیونکہ میں نے اس کی اطاعت میں کسی اور کو شریک کیا ہے۔

(۲) توحید اطاعت اور احادیث:

مختلف حدیثوں میں بھی اس مسئلے پر تاکید ہوئی ہے کہ شرک کی ایک قسم شرک در اطاعت ہے کتبِ حدیث میں جو روایات آئی ہیں ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔

الف:.....حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث میں ہے:

لاطاعة فی معصیة الله، انما الطاعة فی المعروفِ۔

''خدا کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں، اطاعت صرف معروف میں جائز ہے [۱]

ب:.....نہج البلاغہ میں امیر المومنینؑ کا فرمان ہے۔

"لاطاعة المخلوقٍ فی معصیة الخالقِ"

''حکم خدا کی مخالفت میں کسی شخص کی اطاعت جائز نہیں ہے۔ [۲]

ج:.....امام جعفر صادقؑ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے:

"من اطاع رجلاً فی معصیةٍ فقدْ عبدهٗ۔

''جس نے حکم الٰہی کے خلاف کسی شخص کی اطاعت کی گویا اس کی عبادت کی ہے۔

د:.....ایک اور حدیث میں امام محمد باقر علیہ السلام اور اسی طرح امام محمد تقی علیہ السلام سے بھی منقول ہے۔

"من اصغیٰ الیٰ ناطقٍ فقد عبدهٗ۔ فانْ کان الناطق یؤدی عن الله فقد عبد الله، وان کان الناطقُ یودی عن الشیطانِ فقد عبدالشیطان۔"

''جس نے کسی کہنے والے کی آواز پر کان دھرا تو اس کی عبادت کی ہے، اگر کہنے والے نے حکم خدا بتایا تو اس نے خدا کی عبادت کی اور اگر کہنے والے نے شیطان کا حکم سنایا تو اس نے شیطان کی

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۳ صفحہ ۱۴۶۹۔

[۲] نہج البلاغہ ''کلماتِ قصار'' کلمہ ۱۶۵۔

عبادت کی ہے۔"

ھ:.....ہم اس بیان کو امیر المومنین علیہ السلام کی ایک اور حدیث کے ساتھ اختتام کو پہنچاتے ہیں آپؑ نے فرمایا:۔

لادین لمن دان بطاعة المخلوقِ فی معصیة الخالق"

"جو کوئی خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر واضح ہوتا اور توحیدِ عبادت میں اسلامی معیارات معلوم ہوجاتے ہیں۔

o.....خداوند! راہِ توحید پر چلنا بڑا مشکل اور پیچیدہ عمل ہے، تو اس پر پیچ راستے میں ہماری رہنمائی فرما!

o.....بارِالٰہا! مختلف چیزیں چاروں طرف سے ہمیں اپنی اطاعت کی طرف بلاتی ہے.....ہوا و ہوس ہمارے اندر سے اور شیاطین جن وانس باہر سے.....ہم چاہتے ہیں کہ صرف تیرے ہی حکم کے مطیع رہیں، تو اس راہ میں ہماری مدد و نصرت فرما!

ناصر مکارمِ شیرازی

ختم شد جلد سوم تفسیر پیام قرآن۔

تاریخ آغاز: ۱۸ر ذی القعدہ، ۱۴۰۸ھ۔